جلد ۸۸ نومبر ۱۹۷۷ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابو الاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن کے اجزاء

* *

تفسیر پارۂ اوّل	۶/۵۰ روپے
تفسیر سورہ الفاتحہ والبقرہ	۹/- ″
تفسیر سورہ التوبہ	۶/۵۰ ″
تفسیر سورہ الفرقان	۳/- ″
تفسیر سورہ لقمان	۲/- ″
تفسیر سورہ یٰسٓ	۲/۲۵ ″
تفسیر سورہ الفتح	۲/۲۵ ″
تفسیر سورہ الحجرات	۲/۵۰ ″
تفسیر سورہ الرحمٰن	۲/۲۵ ″

اِدارۂ ترجمان القرآن، اِچھرہ - لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۸	نومبر ۱۹۷۷ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ	عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بیس روپے - فی پرچہ -/۲ روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں ابوالعرفان صاحب کا مضمون "پاکستان میں زکوٰۃ کی متوقع آمدنی" اس امید پر شائع کیا گیا تھا کہ قومی مالیات کے ماہرین اور فقہ اسلامی میں گہری بصیرت رکھنے والے اہلِ علم حضرات فاضل مضمون نگار کی توضیحات پر اظہارِ خیال کر کے فکر و نظر کے نئے گوشے اور عملی مسائل کے نئے پہلو سامنے لائیں گے۔ مگر افسوس اس سلسلہ میں آج تک جس قدر خطوط موصول ہوئے ہیں ان میں سوائے یاس و قنوطیت اور طنز و تعریض کے کوئی چیز سامنے نہیں آئی۔ ان خطوط کا لب لباب یہ ہے کہ اس ملک میں زکوٰۃ کا نظام آخر کس طرح کامیابی کے ساتھ نافذ کیا جا سکتا ہے جب کہ ہمارے ہاں دیانت دار اور نیک افراد کا خوفناک قحط پایا جاتا ہے؟ کیا پختہ سیرت و کردار رکھنے والے لوگوں کی کمی سے یہ نظام یکسر ناکام نہ ہو جائے گا؟ اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ نظام جس صورت میں چل رہا ہے اسے اِسی نہج پر چلنے دیا جائے۔

نظامِ زکوٰۃ ہی کے بارے میں نہیں بلکہ نظامِ شریعت کے عملی نفاذ کے بارے میں بھی نہ صرف کم تعلیم یافتہ بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے حلقوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً اسی قسم کے خدشات کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اگر اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کر دیا جائے تو حالات روبہ اصلاح ہونے کے بجائے ابتر ہوں گے اور اس طرح لوگ اللہ کے دین سے بدظنی ہو جائیں گے۔ اس بنا پر اسلامی نظام کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ کتابوں اور وعظوں ہی تک محدود رہے اور میدانِ عمل میں اسے آنا رنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ یہاں اس کی کامیابی کا کوئی امکان

موجود نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی اعتبار سے قوم کے اندر زبردست بگاڑ پیدا ہو چکا ہے، جس کے بھیانک مناظر زندگی کے ہر شعبے میں دیکھے جا سکتے ہیں لیکن اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے باوجود ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ قوم کے ایک وسیع حلقے کے اندر برائی سے نجات حاصل کرنے اور بھلائی کو قبول کرنے کی آرزو موجود ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس ملک کی عظیم اکثریت نظام مصطفےٰ کے نعرے پر لبیک کہتے ہوئے بھٹو آمریت کے مصائب و شدائد سہنے پر کیونکر آمادہ ہو سکتی تھی؟ اس تحریک میں جن لوگوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خدا کے حضور میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، جنہوں نے بڑی ہمت و پامردی سے ہر قسم کے استبداد اور درندگی کا مقابلہ کیا، ان میں سے ایک فیصد افراد بھی ایسے نہ تھے جن کے دل کے کسی گوشے میں ادنیٰ سی خواہش بھی موجود تھی کہ وہ بھٹو کو ہٹا کر خود تختِ اقتدار پر فائز ہوں۔ انہوں نے یہ عظیم قربانیاں صرف اس مقصد کے لیے دیں کہ اس ملک کی عنانِ اختیار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آئے جو یہاں اللہ کے دین کو عملاً نافذ کر دیں۔ جس معاشرے میں اسلام کے ساتھ لوگوں کا اس طرح کا جذباتی لگاؤ موجود ہو اس میں اسلامی نظام کے قیام کے بارے میں مایوسی و ناامیدی کوئی صحت مند رجحان نہیں۔

اس سلسلہ میں اگر کوئی چیز موجب پریشانی ہے تو صرف یہ کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اسلام کے ساتھ اکثریت کی دلی وابستگی اور اس وابستگی کے نتیجے میں اس کے لیے بیش بہا قربانیاں رنگ نہیں لاتیں؟ اور اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی آرزو، آرزو ہی رہتی ہے، شرمندۂ تکمیل نہیں ہونے پاتی؟ اسلام کے نقطۂ نظر سے پاکستان دَورِ حاضر کی بیک وقت سب سے زیادہ خوش قسمت اور سب سے زیادہ بدقسمت مملکت ہے۔ خوش قسمت اس اعتبار سے کہ اسے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے حاصل کیا گیا اور اسی مقصد کی خاطر یہاں بار بار منظم کوششیں ہوئیں، تحریکیں چلیں اور اربابِ اقتدار کے خلاف عوام نے بھرپور جدوجہد کی۔ اس ساری تگ و تاز سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ عوام اس نظام کو غالب کرنے کی دل میں سچی تڑپ رکھتے ہیں۔ یہ اس ارضِ پاک کی تاریخ کا سب سے تابناک پہلو ہے،

کہ عہدِ حاضر میں جب کہ پوری دنیا میں لادین ریاستوں کا غلبہ ہے، پاکستان ہی وہ واحد ریاست ہے جس میں اسلام کی عملداری قائم کرنے کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے۔ رہا اس مملکت کی بدقسمتی کا پہلو تو وہ یہ ہے کہ یہ ملک جو اپنے وجود تک کے لیے اسلام کا رہین منت ہے یہاں دین حق کے عملی نفاذ کی ساری کاوشیں یکے بعد دیگرے ناکام ہو رہی ہیں۔ جو سرزمین لوگوں کی امیدوں کا گہوارہ ہو، وہ اگر اُن کی امنگوں کا پیہم مدفن بنتی رہے تو اس سے انہیں جس قدر شدید ذہنی اذیت پہنچتی ہے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سخت کوشش کے بعد ناکامی یوں بھی زندگی کا بڑا اعصاب شکن تجربہ ہے۔ لیکن جب ناکامی بھی منزل کے بالکل قریب پہنچ کر ہو، اور بار بار ہو، تو اس سے افراد اور قوموں کے اعصاب مفلوج اور اُن کے عزائم اور ارادے بالکل مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے اس ملک کے جو رہنما اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ جب چاہیں گے اسلام کے نام پر قوم کو اپنے پیچھے لگا لیں گے، وہ جس قدر جلدی اس غلط فہمی کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیں اسی قدر ان کے حق میں مفید ہے۔ اس ضمن میں انہیں تین چار باتوں پر خاص طور پر غور کرنا چاہیے۔

پہلی بات جس پر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کی اشد ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ کیا ہمارے رہنما اسلامی نظام کے قیام میں مخلص اور یکسو ہیں اور یہی اُن سب کا منتہائے مقصود ہے اور اس نظام کی عملداری ہی میں وہ نہ صرف اہلِ پاکستان کی بلکہ پوری نوعِ بشری کی فلاح پاتے ہیں یا اُن کی دلبستگی کچھ دوسرے نظامہائے حیات سے ہے مگر ملک کی جذباتی فضا کو دیکھتے ہوئے وہ اسلامی نظام کے ساتھ اپنے تعلقِ خاطر کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں؟ یا وہ اسلامی نظام کے چند اجزا لے کر اور ان کے ساتھ دوسرے نظاموں کے کچھ اجزاء شامل کر کے پاکستان کے لیے اسلوبِ حیات کا ایک نیا مرکب تیار کرنا چاہتے ہیں؟ یا اُن کی زبانوں پر نعرہ تو نظامِ مصطفےٰ کا ہوتا ہے لیکن ذہنوں میں اس نظام کا وہ کوئی ایسا نقشہ رکھتے ہیں جو اس نقشے سے تو مختلف ہے جس کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اجتماعی زندگی کی تشکیل کی تھی اور دورِ حاضر کی بعض مغربی ریاستوں کا چربہ ہے۔ اس ملت کے رہنماؤں کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ عوام کو صرف اسلامی نظام کے نام ہی سے گہری عقیدت اور وابستگی نہیں بلکہ وہ اس بات کے بھی آرزومند ہیں کہ

ہمارے ملک میں جب اس نظام کا نفاذ ہو تو اس کے خدوخال بھی بالکل وہی ہوں جو ہمیں خلافتِ راشدہ کے دَور میں نظر آتے ہیں اور اس سے ہمیں سعادت کے وہی ثمرات حاصل ہوں جو اُس مبارک دَور میں مسلمانوں کو حاصل ہوئے تھے۔ چنانچہ مسلم قوم کی عظیم اکثریت اسلامی نظام کی ایسی کوئی تعبیر یا اس کے کسی ایسے عملی ڈھانچے کو قبول کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں ہو سکتی جو اس مثالی نظام سے مغائرت رکھتا ہو یا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نافذ کیا تھا۔ پاکستان کے مسلمان اپنے ذہنوں میں اسلامی نظام کا ایک مخصوص تصوّر رکھتے ہیں جو انہیں نسلاً بعد نسلٍ ایک مقدس امانت کے طور پر خلافتِ راشدہ سے منتقل ہوا ہے۔ اس لیے جب ان کے سامنے اِس نظام کی کوئی ایسی تصویر لائی جاتی ہے جو اشتراکیت اور مغربی جمہوریت سے مماثلت رکھتی ہو تو وہ وحشت زدہ ہو کر پوچھتے ہیں کہ ہمیں اسلام کے نام پر کس عذاب کی طرف دھکیلا جا رہا ہے؟ جب عوام پر اسلام کے فقہی مسالک کا اختلاف شاق گذرتا ہے تو وہ اسلام کی ان متضاد تعبیروں کو آخر کس طرح گوارہ کر سکتے ہیں جو امیروں کے نظامِ مصطفٰے اور غریبوں کے نظامِ مصطفٰے کی صورت میں کی جا رہی ہیں؟ مسلم عوام کے نزدیک نظامِ مصطفٰے ایک ہی ہے اور اس کی وہی صورت صحیح اور معتبر ہے جس کی سند ہمیں عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ سے ملی ہے۔ اس کے علاوہ دینِ حق کی جس قدر دیگر تعبیریں ہیں وہ بالکل غلط اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ مسلم معاشرے کا اجتماعی ضمیر ان میں سے کسی کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

اس بنا پر مسلم قوم کے رہنماؤں کے لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اسلامی نظام کے قیام کے بارے میں بالکل مخلص ہوں بلکہ اس نظام کے مثالی نقشہ کے متعلق بھی یکسو ہوں جو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ملا ہے۔ اس معاملے میں ان کی ژولیدہ فکری خود ان کے لیے اور ملک وملت کے لیے ہر لحاظ سے مہلک ہے۔

دوسرے ہمارے رہنماؤں کے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہیے کہ اسلام سے ان کی محبت وعقیدت کے دعوے اگرچہ عوام کے لیے ماضی میں بڑی کشش رکھتے تھے مگر اب وہ کشش بتدریج کم ہو رہی ہے۔ اسلام کو اس ملک کی غالب قوت بنانے میں انہیں بار بار جس ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اس سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس ناکامی کے دیگر اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اُن کے رہبر جس دینِ حق کی

محبت کے دعویدار رہیں ان کی عملی زندگیاں ان کے اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتیں۔ اسلام کوئی پیکر خیالی نہیں جس کی جھلک زندگی کے عملی شعبے میں نہ دیکھی جاسکتی ہو بلکہ یہ ایسا نظام فکر و عمل ہے جو انسان کی پوری زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا داعی بھی ہو اور اس دعوت پر وہ عوام کو اپنے ارد گرد جمع کر کے ان سے ہر قسم کے ایثار اور قربانی کا مطالبہ کرے مگر وہ خود اسلام کے کم سے کم مطالبات پورے کرنے پر بھی آمادہ نہ ہو تو عوام دینِ حق کے ساتھ اس کے دعوائے محبت پر کب تک اعتبار کرتے رہیں گے؟ کیا وہ یہ سوچنے میں کسی قدر حق بجانب نہ ہوں گے کہ اسلام کا جو شیدائی اور اسلامی نظام کے قیام کا جو علمبردار اپنی زندگی کے خاکے میں اس مقدس نظام کے رنگ بھرنے کے لیے تیار نہیں وہ اسے پورے ملک میں کیسے نافذ کرے گا؟ کسی ارفع و اعلیٰ نظریہ حیات سے تعلقِ خاطر کا دعویٰ بھی بذاتِ خود قابلِ قدر ہے لیکن اگر اس تعلقِ خاطر کی تصدیق عملی اقدام سے نہ ہو تو یہ دعویٰ کچھ مدت کے بعد اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔

تیسری چیز جو ہمارے رہنماؤں کے غور و فکر کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ قوم سے مکمل اتفاق و اتحاد اور جاں نثاری کا مطالبہ کرتے ہیں اور انہیں یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب تک وہ اپنے اندر یہ صفات پیدا نہیں کرتے اس وقت تک ان کی کشتی ساحلِ مراد تک نہیں پہنچ سکتی تو آخر وہ خود بلند حوصلگی، عالی ظرفی اور ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف خوش دلی سے دستِ تعاون بڑھانے سے کیوں گریزاں ہیں؟ کیا انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ان کی چھوٹی چھوٹی باہمی رنجشیں قوم کے اندر زبردست انتشار پیدا کرتی ہیں؟ جن لوگوں نے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے ان کی رائے یہ ہے کہ زندگی میں اصولی معاملات بہت ہی کم ہوتے ہیں — انسان کو زیادہ تر عملی مسائل سے سابقہ پیش آتا ہے جنہیں اگر نیت بخیر ہو تو تدبر اور فراخدلی کے ساتھ بآسانی حل کیا جاسکتا ہے۔ جن باتوں کو ہم اصولوں کا اختلاف کہہ کر ایک دوسرے سے کٹتے بلکہ ایک دوسرے کے درپے آزار ہوتے ہیں وہ درحقیقت انسان کی انا کے مسائل ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم میں اس بات کی ہمت اور جرأت نہیں ہوتی کہ ہم اس افسوسناک صورتِ حال کو بطور حقیقت تسلیم کرلیں کیونکہ اس سے ہمارے اخلاص اور بے لوثی پر حرف آتا ہے اس لیے ہم انا کے ٹکراؤ کو اصولوں کے اختلاف کہہ کر اپنے اخلاص کا بھرم قائم رکھنے کی

کوشش کرتے ہیں - ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب ہمارے مفادات کا تقاضا کسی فرد، گروہ یا جماعت کے ساتھ اتفاق و اتحاد کا ہو تو ہم بڑے سے بڑے اختلاف کو نظر انداز کر کے اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی سعی کرتے ہیں لیکن اگر وہ مفادات باقی نہ رہیں تو پھر اس اتحاد سے گریز کی راہیں ڈھونڈنے لگتے ہیں - ایک با اصول آدمی کے لیے ضروری ہے کہ کسی فریق کے ساتھ اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرے لیکن اُسے ہر فیصلہ کُن مرحلہ پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جس بات کو وہ اپنے ذہن کے مطابق اصول کا معاملہ قرار دے کر غیر مصالحانہ رویہ اختیار کر رہا ہے وہ سرے سے اصول کا معاملہ ہی نہ ہو بلکہ اس کی انانیت نے کسی عملی اقدام کو اصول کا مسئلہ بنا کر اس کی قدر و منزلت کو غیر معمولی حد تک بڑھانے کی کوشش کی ہو - اصول بال سے باریک پل صراط نہیں جس پر سے ایک قدم اِدھر یا اُدھر انسان کو جہنم رسید کر سکتا ہے بلکہ اصول ایک وسیع دائرہ ہوتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسان حالات کے مطابق توافق و تعاون کی راہیں نکالتا ہے - لیکن انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ جب وہ اپنے حالات کے پیش نظر اپنے لیے کوئی الگ راہ اختیار کرتا ہے تو اپنے طرز عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اپنے آپ کو اصول پرست بنا کر پیش کرتا ہے - چنانچہ جو حضرات اِس قوم کی رہنمائی کا عزم لے کر اُٹھے ہیں انہیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ان کی بے غرضی و بے نفسی، اُن کے جذبۂ اتحاد و ایثار کو دیکھ کر ہی قوم کے اندر یہ صفات پیدا ہوں گی اور اگر خود ان کی زندگیاں ان اعلیٰ صفات کا مظہر نہیں بنتیں تو پھر عوام سے یہ توقع رکھنا کہ ان کا طرزِ عمل ان صفات کا آئینہ دار ہو محض خیال خام ہے -

---

مسلم عوام کا دینی جذبہ ایک پائیدار اور بامقصد قوت میں ڈھل کر اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے میں جو بار بار ناکام ہو رہا ہے تو اُس کی ایک وجہ عامۃ الناس اور رہنماؤں کے مابین مستقل ربط و ضبط کی افسوسناک حد تک کمی ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان کے عمل کا محرک رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اسی کی خاطر وہ لوگوں کی مدح و ستائش سے بے نیاز ہو کر بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے - لیکن انسان چونکہ فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس لیے اس کے اندر یہ خواہش ہمیشہ موجود رہتی ہے کہ جن لوگوں کے ہمرکاب ہو کر وہ جد و جہد کر رہا ہے اور جن افراد کی قیادت میں قدم بہ قدم منزل کی طرف بڑھ رہا ہے وہ ہر گام پر اس کے خیر خواہ اور

دمساز رہوں اور اُس کے دُکھ درد میں شریک ہوں تاکہ وہ کسی مرحلہ پر بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ سیاسی اور دینی جماعتوں میں جہاں کارکن کسی لالچ کے بغیر محض مقصد کی محبت میں سرشار اپنے قائدین کے اشاروں پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار رہوں وہاں وہ کسی طور پر بھی یہ طرزِ عمل برداشت نہیں کرسکتے کہ ان کے ساتھ ان کے رہنما محکوموں کا سا برتاؤ کریں۔ اُن کے اندر فطری طور پر یہ خواہش موجود رہتی ہے کہ وہ اگر اپنے قائدین پر جان نثار کریں تو اُن کے سربراہ بھی اُن کے دلسوز فدائی بنیں اور انہیں اپنی ذات پر ترجیح دیں اور خوشی اور غم کسی حال میں بھی انہیں فراموش نہ کریں۔ اس اندوہناک حقیقت سے آخر کس طرح انکار کیا جاسکتا ہے کہ لاتعداد مخلص، ایثار پیشہ اور بہادر کارکن محض رہنماؤں کی سرد مہری کی وجہ سے مختلف میدانوں میں اجتماعی جدوجہد سے الگ ہوکر بیٹھ گئے جس سے اس جدوجہد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ عام انسانوں میں ہوش پر جوش غالب رہتا ہے۔ مگر یہی لوگ تحریک کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔ انہیں نہ تو کسی منصب کا لالچ ہوتا ہے نہ روپے پیسے کی آرزو۔ وہ صرف مناسب حوصلہ افزائی کے خواہش مند ہوتے ہیں اور اگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو تو وہ یاس و قنوطیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر اُن کی یہ آرزو بھی کوئی ایسی آرزو نہیں جسے پورا کرنے میں قائدین کو ہفت خواں طے کرنے پڑیں۔ محبت اور پیار کے چند جملوں سے وہ اُن کے دل بڑی آسانی سے موہ سکتے ہیں اور اُن کے اندر باطل کے خلاف لڑنے کا عزمِ صمیم پیدا کرسکتے ہیں۔

ایک اور چیز جس کی طرف اس قوم کے کارپردازوں کو خاص طور پر توجہ دینی چاہیے وہ کارکنوں کی صحیح تربیت کا مسئلہ ہے۔ انسان بسا اوقات ان کے متضاد طرزِ عمل کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ وہ کارکن جو ایک وقت میں ہر قسم کے خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے مردانہ وار جبر و استبداد کی قوتوں سے جا ٹکراتے ہیں دوسرے وقت میں نفس کی کسی ادنیٰ خواہش پر غلبہ حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کارکنوں کی صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے طرزِ فکر میں اُلجھاؤ اور طرزِ عمل میں ناہمواری رہتی ہے جس کی وجہ سے اُن کی صلاحیتیں نہ تو پوری طرح بارآور ہوتی ہیں اور نہ صحیح طور پر بروئے کار آتی ہیں۔ ہنگامی حالات میں اُن کے جذبات کے اندر غیر معمولی تلاطم پیدا ہوتا ہے اور وہ سیلاب کی صورت میں بہہ نکلتے ہیں۔ لیکن جب حالات قدرے پُرسکون ہونے (باقی بر صفحہ ۴۸)

تعزیراتِ اسلام

از جناب مولانا بشیر احمد صاحب قاضی تحصیل باغ (آزاد کشمیر)

(جناب مولانا بشیر احمد صاحب "مجموعہ تعزیراتِ اسلام" کے نام سے اسلامی قوانین کی جدید طرز پر دفعہ بندی (CODIFICATION) کے سلسلے میں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اس مجموعہ کے اجزاء بالاقساط ترجمان القرآن میں پیش کیے جائیں گے۔ (ادارہ))۔

اسلامی قوانین کو عدالتوں میں عملاً نافذ کرنے کے لیے ایک اہم ضرورت ان کی دفعہ بندی کی ہے جس سے پیش آمدہ مسائل کا حکم بروقت معلوم کیا جا سکے۔ فتاویٰ عالمگیری اسی طرح کی ضرورت کے پیش نظر اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کرایا تھا۔ اسی طرح سلطان عبدالحمید ثانی نے مجلۃ الاحکام العدلیہ کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کرایا تھا۔ اس دور میں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی قوانین کو دفعہ بندی کی ہیئت دے کر ان سے استفادہ میں سہولت پیدا کی جائے خصوصاً اس دور میں جب کہ باصلاحیت اور محنتی رجال کار کا قحط ہے۔ دوسری طرف اسلامی قوانین ہماری کتب فقہ کے اندر ابواب و فصول کی شکل میں اس طرح موجود ہیں کہ اُن میں قانون کے بیان کے ساتھ ائمہ کے اختلافات اور اُن کے دلائل کو بھی ساتھ ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور اکثر و بیشتر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ایک ہی امام کے متبعین کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مفتیٰ بہ قول کو تلاش کر کے عمل کا مدار اسی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کی چھان بین کرنے کے لیے بہترین صلاحیت کے ساتھ ساتھ کافی وقت کی بھی ضرورت ہے جس کا ہمارے معاشرے میں تقریباً فقدان

ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی قوانین کو بھی دفعہ بندی کا قالب پہنایا جائے تاکہ اس کی رفتار میں اس طرح کی عملی دشواریوں کا خاتمہ ہو جائے۔

اسی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے ابتدائی قدم کے طور پر "مجموعہ تعزیرات اسلام" کے نام سے بعض نافذ شدہ قوانین کی دفعہ بندی کی جاتی ہے۔ مگر آگے جانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسلامی تعزیرات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جائے تاکہ افہام و تفہیم میں سہولت پیدا ہو جائے۔

رائج الوقت ملکی قانون میں جب تعزیر کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد مطلق سزا ہوتی ہے خواہ یہ سزا کسی بھی جرم کے بدلے میں دی گئی ہو۔ جبکہ اسلامی قوانین میں جب تعزیر کے لفظ اطلاق ہوتا ہے تو اس سے مراد مخصوص قسم کی سزا ہوتی ہے یعنی ایسی سزا جس کا تعین قرآن و سنت میں موجود نہ ہو بلکہ اس کا انحصار قاضی مجاز کی صوابدید پر ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب لینا غلط ہوگا کہ ہماری کتاب مجموعہ تعزیرات اسلام میں صرف ان سزاؤں کا ذکر ہے جن کا تعین قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے اس لیے کہ نام کی وضع کی ایک قسم تعزیر کے اعتبار سے ہے مگر اس میں باقی سزاؤں کی اقسام بھی مذکور ہوں گی۔

اسلامی سزاؤں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ تعزیر ۲۔ حد ۳۔ قصاص

پھر حد کی پانچ قسمیں ہیں:۔ ۱۔ حد سرقہ ۲۔ حد قطع الطریق ۳۔ حد قذف ۴۔ حد زنا ۵۔ حد شرب خمر

اور قصاص کی دو قسمیں ہیں:۔ ۱۔ قصاص بالنفس ۲۔ قصاص دون النفس۔ پہلی قسم میں قتل کا بدلہ قتل ہوتا ہے اور دوسری قسم میں اعضاء و جوارح میں جراحات کا بدلہ ہوتا ہے۔

اس وقت حد سرقہ اور حد قطع الطریق سے متعلقہ قوانین کی دفعہ بندی کی جاتی ہے۔ ان دونوں کی شرائط مشترک ہیں البتہ شرائط سرقہ میں ایک شرط یہ ہے کہ سارق نے خفیہ طور پر سرقہ کیا ہو کہ قابض کو اس کا علم نہ ہو جبکہ حد قطع الطریق میں بھی خفیہ طور پر جرم کا ارتکاب شرط ہے مگر اس میں خفیہ سے مراد قابض مال کا عدم علم نہیں ہے بلکہ امیر المومنین کا عدم علم مراد ہے یعنی اس کے علم کے بغیر اس کی حکومت میں قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔ ان جرائم کی مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ سرقہ کی تعریف بھی آگے آئے گی مگر اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعریف میں اس فرق کو واضح کیا جائے جو مروجہ عصری

قانون میں سرقہ کی تعریف میں پایا جاتا ہے۔

مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۷۸ میں سرقہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ "جو کوئی بددیانتی سے کوئی مال منقولہ کسی شخص کے قبضے سے اس کی بلا رضامندی لینے کی نیت سے اسے لینے کے لیے اس مال کی تبدیل بیجا کرے تو کہا جائے گا کہ شخص مذکور نے سرقہ کا ارتکاب کیا ہے"۔ اس تعریف سے سرقہ کی قسم "موجب تعزیر" کا ثبوت تو ہو جائے گا مگر سرقہ موجب حد کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ موجب حد کے لیے من جملہ شرائط سے یہ بھی ایک بنیادی شرط ہے کہ مال کو خفیہ طور پر لیا جائے، جس کا ذکر اس تعریف میں موجود نہیں ہے۔ پھر مال کی مقدار کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کا ذکر بھی اس تعریف میں نہیں ہے۔ نیز "کسی شخص کے قبضے سے" کی قید سے لازم آتا ہے کہ اگر ایک چور مال کی چوری کرے اور ابھی اس پر حد جاری نہ ہوئی تھی کہ اسی مال کو دوسرا آدمی چوری کر کے لے جائے تو پہلے کی شکایت پر دوسرے چور کو بھی پہلے جیسا چور تصور کیا جائے گا حالانکہ شرعاً ایسا نہیں ہے بلکہ فرق ہے۔ اس لیے کہ پہلے چور نے ایسے قابضِ مال سے سرقہ کیا ہے جس کا قبضہ مال پر قانونی قبضہ تھا، اور دوسرے چور نے جب پہلے چور سے مال کا سرقہ کیا تو اس وقت پہلے چور کا قبضہ مال پر غیر قانونی تھا لہٰذا دونوں کا جرم ایک نوعیت کا نہیں ہو سکتا مگر مذکورہ تعریف سرقہ پر لازم آتا ہے کہ جرم ایک ہی نوعیت کا ہو۔ اسی طرح "تبدیل بیجا" کا لفظ بھی کافی مبہم ہے۔ بیجا تو یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ مال کو گھر کے کمرہ سے نکال کر گھر کے صحن میں رکھ لے۔ اس طرح کے فعل سے اس کو تعزیر تو دی جا سکتی ہے مگر حد نافذ نہیں ہو سکتی کیونکہ حد کے لیے ضروری ہے کہ شے کو محفوظ جگہ سے اٹھا کر قابض کے مکان یا اس کی جائے محفوظ سے بھی باہر کر دے۔ غرضیکہ اس تعریف میں شرعی اعتبار سے کافی نقائص پائے جاتے ہیں لہٰذا اس تعریف کو سرقہ موجب حد کے لیے کافی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۷۸ کی تشریح نمبر ۱ مع تمثیل بھی شرعی قانون کے اعتبار سے کافی نقائص کی حامل ہے۔ تمثیل یہ ہے:

"کوئی شے جب تک کہ وہ زمین سے پیوستہ رہے چونکہ مال منقولہ نہیں ہے لہٰذا ایسی شے نہیں ہے جس کی نسبت سرقے کا ارتکاب ہو سکے مگر جونہی کہ وہ زمین سے جدا کی جائے اس وقت شے مذکورہ چرانے کے قابل ہو جائے گی۔ مثلاً زید بکر کی زمین میں سے ایک درخت اس نیت سے کاٹے کہ اس کو بکر کے قبضے سے بکر کی بلا رضامندی بددیانتی سے لے لے۔ جونہی بکر نے اس درخت کو اس طرح

سے لے جانے کے لیے کاٹ لیا سرقہ کا مرتکب ہوا۔"

اس تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو قابض کی بلا رضامندی بددیانتی سے لے جانے کے لیے چرانے کے قابل کر دے تو وہ سارق کہلائے گا۔ حالانکہ قانونِ شرعی میں وہ اس وقت سارق کہلائے گا جبکہ اس چیز کو مالک کے قبضہ سے بھی اس کے علم و رضامندی کے بغیر باہر نکال دے۔ لہٰذا تمثیل مذکورہ میں مجرم تاوان ادا کرنے کا ذمہ دار تو ٹھیرایا جائے گا مگر اس کو حد کی سزا نہیں دی جائے گی۔

بعض لوگ یہ شبہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی تعزیرات اتنی سخت ہیں کہ ان کا متحمل ہمارا معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے شبہات انہی لوگوں کو پیدا ہوتے ہیں جن کو اسلامی قوانین کا گہرا مطالعہ نہیں ہے۔

جہاں تک قانون کی سختی کا تعلق ہے اگر اس کو تسلیم بھی کیا جائے تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ قانون اگر سخت ہوگا تو اتنا ہی ملک کا امن و امان بھی مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگا۔ قتل و غارت اور فساد و بگاڑ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند رہے گا۔ مگر اسلامی تعزیرات میں تکمیل جرم سے لے کر ثبوت جرم تک کے مراحل کو دقت نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ شبہ انتہائی بے وزن معلوم ہوگا۔ مثلاً عام مقدمات کے ثبوت کے لیے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کو کافی سمجھا گیا ہے مگر حدود اللہ میں عورتوں کی گواہی کو سرے سے قبول ہی نہیں کیا گیا۔ پھر حدود میں حد سرقہ کی سزا قطع ید ہے۔ بلاشبہ یہ سخت سزا ہے مگر اس کے اندر بھی عورتوں کی گواہی کو مسترد کرنے کے علاوہ اس کے ثبوت کو بے شمار شرائط عاید کر کے مشکل تر بنا دیا گیا ہے۔ پھر اس سے بھی سخت سزا رجم کی ہے مگر اس کے ثبوت کے لیے بجائے دو مردوں کے چار عینی مردوں کی شہادت کو ضروری قرار دے کر انتہائی دشوار کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کی کڑی شرائط کا نتیجہ یہی نتیجہ نکلے گا کہ ان سزاؤں کا وقوع بہت شاذ و نادر ہی ہوگا۔ پھر حد کے ثبوت کے بعد بھی اگر کوئی ادنیٰ شبہ پیدا ہو جائے تو حد ساقط ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اگرچہ یہ سخت سزائیں ہیں تو ان کے ثبوت کو بھی سخت کر دیا گیا ہے تاکہ ان کی نوبت بہت ہی کم آئے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اگر مجرمین سے حد ساقط ہو جائے تو ان کو کھلی چھٹی مل جائے گی۔ بلکہ جرائم کے سدباب کے لیے ان پر تعزیری

سزاؤں کو عائد کیا جائے گا جن کے ثبوت میں اتنی شدت نہیں ہے۔ مزید تفصیل اس مجموعہ میں ذکر کی جائے گی۔

اس مجموعہ کی تیاری میں ان امور کا خیال رکھا گیا ہے:۔

۱۔ معتمد اور مشہور کتابوں پر اعتماد کیا گیا ہے۔

۲۔ مفتیٰ بہ قول کو دفعہ کی عبارت میں ذکر کیا گیا ہے اور ائمہ کے اختلافات کو اس دفعہ کے ذیل میں تشریح کے عنوان سے بیان کر دیا گیا ہے۔

۳۔ حنفی مسلک کو دفعہ کی بنیاد بنایا گیا ہے اور باقی ائمہ کے مسلک کو اس کے ذیل میں بیان کر دیا گیا ہے۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ہ

(باقی)

حُسنِ سلوک

مولانا حبیب اللہ صاحب

"خدا کے بندو ! اپنے خدا سے ڈرو اور اپنے بھائیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا رویہ اختیار کرو"۔ یہ پوری انسانیت کا دینی و اخلاقی اثاثہ ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات ملاحظہ فرمائیں۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ
مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا
كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ
تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (النساء: ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں
ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا
اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت پھیلا
دیئے اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور
رشتوں کا لحاظ رکھو بے شک اللہ ہر وقت تمہیں دیکھ
رہا ہے۔

ہم سب ایک رب کے بندے اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ہمارے مابین بہت گہرے اور مضبوط رشتے ہیں۔ ہم اپنے رشتوں کا ہمیشہ پاس و لحاظ رکھیں، انہیں قائم رکھیں، ٹوٹنے نہ دیں، ان کے حقوق ادا کرتے رہیں۔ اس تصور کے ساتھ کہ ہمارا رب ہر آن ہمیں دیکھ رہا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ
عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرُ ۨ الَّذِىْ خَلَقَ
الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ
اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ

بڑی برکت والا ہے وہ خدا جس کے قبضہ میں
(کائنات کی) بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر
ہے، وہ جس نے موت اور زندگی پیدا کی کہ تمہارا
جانچ ہو، تم میں کس کا کام زیادہ اچھا ہے اور

الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ (الملک ۱-۲)

وہی زبردست اور مغفرت فرمانے والا ہے۔

یہ اچھے کام جن میں ہماری جانچ ہے یہی تو ہیں کہ ہم اللہ اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا

اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھیراؤ اور ماں باپ سے بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پاس کے ہمسایے اور دور کے ہمسایے اور ساتھی اور راہ گیر اور اپنی باندی غلام سے۔ بے شک اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانے والا، ڈینگ مارنے والا، جو خود بخل کریں اور دوسروں سے بخل کرنے کو کہیں اور اللہ نے جو انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اُسے چھپائیں اور کافروں کے لیے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے

اللہ کا حق یہ ہے کہ ہم اس کی بندگی کریں اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ بنائیں اور بندوں کا حق یہ ہے کہ ہم ان کے ساتھ احسان کریں، بھلائی کا رویہ اختیار کریں۔ اترانے والے اور ڈینگ مارنے والے اللہ کو پسند نہیں ہیں جو خود بھی بخل کرنے والے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں۔ اللہ کی دی ہوئی دولت کو چھپاتے ہیں۔ یہی کافر اور ان بھلائیوں کے انکاری ہیں۔ ان کے لیے اللہ نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس سے وہ ایک دن دوچار ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الحج ۔ ۷۷)

اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلے کام کرو۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم اور فلاح و کامرانی کی واحد راہ یہی ہے کہ اللہ کی بندگی کی جائے اور بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کا برتاؤ کیا جائے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (النحل-۹۰)

بے شک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف کا حسنِ سلوک کا اور رشتہ داروں کو دینے کا اور منع فرماتا ہے بے حیائی اور بُری بات اور سرکشی سے، تمہیں نصیحت فرماتا ہے کہ تم دھیان کرو۔

بندوں کے ساتھ ہمارا معاملہ کیا ہو؟ عدل کا، احسان کا، ان کی خدمت کا اور بے حیائی، بُرائی اور سرکشی سے اجتناب کا - اللہ نے ہمیں ان باتوں کی تاکیدی نصیحت فرمائی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے خاص انداز میں تلقین فرمائی کہ جو لوگ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی تو پابندی کرتے ہیں لیکن بندوں کے حقوق پامال کرتے ہیں اور ان کے ساتھ بُرائی سے پیش آتے ہیں وہ قیامت کے دن میری اُمت کے مفلس اور کنگال ہوں گے۔ ان کے ہاتھ نیکیوں سے خالی ہوں گے۔ سر سے پاؤں تک گناہوں میں ملوث ہوں گے۔ وہ سر کے بل جہنم کی دہکتی آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔

یہ ہیں اسلام کی بنیادی ہدایات، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اے خدا کے بندو! تم اپنے خدا سے ڈرو اور بندگانِ خدا کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا رویہ اختیار کرو، دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہو گے۔ آپ دنیا کے کسی بھی مذہب یا کسی بھی شریف انسان کے قلب و ضمیر کو جھانک کر دیکھیں تو آپ کو ہر جگہ یہی پاکیزہ تعلیم ملے گی بلکہ حد تو یہ ہے کہ بندوں کو انتہائی بے دردی کے ساتھ لوٹنے کھسوٹنے والے افراد اور گروہ بھی انہیں نیکیوں اور بھلائیوں کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ خوش آئند وعدوں کے سبز باغ دکھا کر قوموں اور گروہوں کو کلی تباہی و ہلاکت کی راہوں پہ لگاتے ہیں۔ آپ ایک طرف ان تعلیمات کو نگاہ میں رکھیں اور دوسری طرف بندوں کے عمومی حالات اور ان کے سنگین مسائل کو دیکھیں۔ فقر و فاقہ، گرانی و قحط سالی، غربت و افلاس اور عام پسماندگی، تشدد و لاقانونیت کی بڑھتی ہوئی لہر، مرض و جہالت، ظلم و ناانصافی، معاشی استحصال، اونچ نیچ، منافرت، عدم رواداری، طرح طرح کی اخلاقی کمزوریاں خصوصاً نئی نسل میں اخلاقی انارکی، نفس پرستی، اباحیت و خدا فراموشی اور آخرت سے غفلت وغیرہ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان حالات میں ان بنیادی پاکیزہ تعلیمات کو خلوص کے ساتھ اپنانے والے کون لوگ ہوں گے؟ کہاں سے آئیں گے؟ کیا اسی طرح پوری انسانیت تباہ ہوتی رہے گی اور ہم تماشا دیکھتے رہیں گے؟ کیا اس صورت میں ہم اپنے آپ کو اس کلی تباہی سے بچا سکیں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں، ہم سب تباہ ہوں گے اور ایسے تباہ ہوں گے کہ نہ تو ہمارے حال پہ کوئی ترس کھائے گا اور نہ کوئی آنکھ روئے گی۔ یہ انجام تو اس دنیا کا ہوگا۔ آخرت میں جب اللہ کے حضور پیشی ہوگی تو ہم وہاں مجرم ہوں گے، ہمارا دل مجرم ہوگا۔ جس طرح ہمیں اللہ کے بندوں پر رحم نہیں آیا ہے، اللہ بھی ہم پہ رحم نہ فرمائے گا۔ ہمارے حق میں دردناک عذاب کا فیصلہ ہوگا۔ ہم دہکتی آگ کے حوالے ہوں گے اور اس سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

آیئے ہم اپنے فرض کو پہچانیں، اپنے آپ کو اور اپنے نونہالوں کو دنیا و آخرت کے بھیانک انجام سے بچانے کی فکر کریں۔ بھلائیوں کا نعرہ لگانے والے اور دنیوی فلاح و بہبود کے وعدوں کے سبز باغ دکھانے والے تو بہت ہیں، لیکن اپنے خدا سے ڈرنے والے، انسانیت کے حقیقی خیرخواہ انہیں دنیا و آخرت کی کامل فلاح و بہبود سے ہم کنار دیکھنے کی آرزو رکھنے والے، سچے دل سے ان کے دکھ درد میں ہاتھ بٹانے والے، ان کی خدمت اور بھلائی کے کاموں میں مل جل کر لگ لپٹ جانے والے، اس مشترک اور عالمی سچائی کا پیکر اور نمونہ بننے والے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انسانیت اس وقت اس بات کی محتاج ہے کہ تمام خیر پسند بھائی اس فرض کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوجائیں اور مل جل کر اس ذمہ داری کو ادا کریں۔ درج ذیل کام ہماری اوّلین توجہ کے طالب ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے غربت و افلاس اور عام پسماندگی کو لیجیے۔ باشندگان ملک کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو ان آفات و مصائب کو دُور کرنے کے کام سے کوئی عملی دلچسپی نہیں رکھتی۔ ان کے نزدیک یہ کام حکومت کا ہے اور یہ بات کسی حد تک ہے بھی درست۔ لیکن اس کے باوجود اس ضمن میں ہم پر بھی کچھ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔

ہر معاملے میں حکومت ہی پہ بھروسہ کرنا تنہا ہمارے ہی ملک کی خصوصیت نہیں ہے، ایشیا اور افریقہ کے تمام نو آزاد اور ترقی پذیر ممالک کے باشندوں کا یہی حال ہے۔ چونکہ دَورِ غلامی میں یہ ممالک استحصال کا شکار اور نہایت پسماندہ تھے۔ آزادی کے بعد ان کے وسائل و ذرائع بھی بڑھے اور

ترقی یافتہ ممالک سے امداد اور قرض لے کر اپنی پس ماندگی دُور کرنے کے انہیں مواقع بھی ملے، فلاحی ریاست کے تصور سے عوام کو حکومت سے بہت زیادہ توقعات ہوگئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں مغربی ملکوں کے مقابلہ میں رضاکار، رفاہی تنظیمیں بہت کم ہیں۔ سب کچھ حکومتوں ہی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی فرض شناس اور نیک نیت ہو، اس کے وسائل و ذرائع اور افرادی قوت بہت ہو پھر بھی وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے عملہ اور پبلک کے بھرپور تعاون کی بہرحال محتاج ہوتی ہے۔ اگر باشندگانِ ملک ان مسائل میں دلچسپی نہ لیں اور رائے عامہ کا دباؤ نہ ہو تو نہ حکومت کی مشینری چوکس رہ سکتی ہے اور نہ فلاحی ریاست کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں، بلکہ عام لوگ تو محروم رہ جائیں گے اور چند خوش حال اور حکام رس لوگ ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی خوش حالی میں مزید اضافہ کرلیں گے۔

یہ راز کس سے پوشیدہ ہے کہ کمیونٹی ڈویلپمنٹ، سوشل ویلفیئر اور پس ماندہ طبقات کو اُونچا اُٹھانے کے لیے قومی سرمایہ سے ہر پانچ سالہ منصوبے میں اربوں روپے رکھے جاتے ہیں۔ ملک و بیرونِ ملک کی متعدد رفاہی و فلاحی انجمنیں اس سلسلے میں طرح طرح سے امداد کرتی ہیں۔ لیکن یہ سارا کام سرکاری و نیم سرکاری مشینری ہی کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ مگر ہماری ان مسائل سے عدم دلچسپی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کاموں میں کوئی برکت نظر نہیں آتی۔ غیر مستحق لوگ ناجائز فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور مستحق لوگ محروم رہ جاتے ہیں اور اپنے بہتر سرمایہ اور وسائل و ذرائع سے بھی غریبی، پس ماندگی دُور کرنے اور عوام خصوصاً دیہاتوں کی بڑی اکثریت کی مصیبتیں دُور کرنے میں وہ مدد نہیں ملتی جو ملنی چاہیے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ قومی مصیبتوں اور قحط و قلت کے مواقع پر بھی مدد، خدمت اور ہمدردی کا جذبہ اُبھرنے کے بجائے کچھ افراد اور گروہوں میں اس صورتِ حال سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی تحریک بڑھتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں سے اس مصیبت میں اور اضافہ کا موجب بنتے ہیں حالانکہ یہ مواقع اپنے ذاتی اور گروہی مفادات سے بلند ہوکر مصیبت زدہ بھائیوں کو راحت پہنچانے کے لیے کچھ کر گزرنے کا ہر فرد اور گروہ سے تقاضا کرتے ہیں۔

ہمیں مل جل کر ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آئیں اور ناگہانی اور قومی مصیبتوں کا مل جل کر مقابلہ کریں۔

۲۔ دوسرا اہم کام ملک میں تشدد کی بڑھتی ہوئی لہر اور لاقانونیت کے روکنے کا ہے۔ اجتماعی زندگی میں لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایات پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ ہر شخص قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے یا اپنا جائز ناجائز فائدہ منوانے کے لیے تشدد پر اُتر آئے۔ یہ نہایت خطرناک رجحان ہے۔ اس سے ظلم و تشدد اور توڑ پھوڑ، جانی و مالی نقصان کے علاوہ ملک کی تعمیر و ترقی کے کاموں کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ہم کو مل جل کر اس فضا کو بدلنے اور باہمی خیرسگالی اور مفاہمت کے جذبات اُبھارنے کی فکر کرنی چاہیے۔ ہر فرض شناس کو عدل و انصاف پر قائم رہنے کے لیے آمادہ کرنا چاہیے۔ ہر جگہ خیر پسندوں کا ایک گروہ تیار کرنا چاہیے جو تشدد اور لاقانونیت کی روک تھام کے سلسلے میں ہر وقت فکر کرسکے اور ان اسباب کے ازالے کی پیشگی فکر کرے تاکہ اس کی نوبت نہ آنے پائے۔ نئی نسل میں یہ رجحان بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہمیں ان کی قوتوں کو تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف لگانا چاہیے۔ ایک نہایت زریں اصول جو اجتماعیت کی جان ہے اور جس کی دُنیا کے تمام مذاہب نے نہایت پُرزور الفاظ میں تعلیم دی ہے اس کو ذہن نشین کرانے کی فکر کرنی چاہیے۔ دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی زیادہ سے زیادہ بیدار رکھنا چاہیے کہ "جیسی کرنی ویسی بھرنی" ہمیں بہرحال اپنے کرتوتوں کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ تجربہ شاہد ہے کہ دُنیا میں بھی بُرے کرتوتوں کا بدلہ اچھا نہیں ہوتا اور آخرت میں جو نتائج رُونما ہوں گے وہ اس سے زیادہ ہولناک ہوں گے۔

۳۔ تیسرا اہم کام۔ نئی نسل میں بڑھتی ہوئی انارکی اور اباحیت پر روک لگانے اور ان کا رُخ تعمیر کی طرف موڑنے کا ہے۔ ہمارا ملک اپنے محل وقوع، اپنے وسائل و ذرائع اور اپنی افرادی قوت کے لحاظ سے دُنیا کے چند بڑے ملکوں میں سے ایک ہے۔ ہمارے بزرگوں کی انتھک کوششوں اور ایثار و قربانی کے بعد ملک کی باگ ڈور باشندگانِ ملک کے ہاتھ میں آئی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے وطنِ عزیز کی تعمیر و ترقی اور باشندگانِ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے مل جل کر کوشش کریں اور افراد اور جماعتیں انفرادی و اجتماعی طور پر اس کی خدمت اور اسے مثالی بنانے کے لیے جدوجہد میں اپنا حصہ ادا کریں۔ ہمارے ملک کا مستقبل ہماری نئی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے یہی نوجوان اس ملک کے معمار اور کرتادھرتا بننے والے ہیں۔ ان سے بجا طور سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی قابلیت، فنی صلاحیت

اور کارکردگی میں اضافہ کر کے ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لیں۔ مگر اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ان کی بڑی تعداد میں ایسے رجحانات پروان چڑھ رہے ہیں جو نہایت درجہ تشویشناک ہیں۔ ان کو نہ خدا کا خوف ہے نہ قانون کا ڈر، نہ ملک اور باشندگان ملک کا درد ہے، نہ ان کی خدمت کا شوق، نہ دین و ایمان کا پاس و لحاظ ہے اور نہ والدین کی پسند و ناپسند کا خیال۔ وہ کسی اصول و ضابطے کی پابندی گوارا کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔ ان کی حرکات و سکنات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کسی کی کوئی پروا نہیں، جو جی چاہے گا کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لاڈلوں سے باشندگان ملک کی آنکھیں ٹھنڈی ہونے کے بجائے انہیں دکھ پہنچتا ہے۔ یہ ملک کی کیا خدمت کر سکیں گے، خود اپنی صحت و اخلاق کو تباہ کر رہے ہیں اور اپنی حرکات و سکنات سے امن و سکون کو درہم برہم کرنے کے ساتھ تعمیری کوششوں کو بھی شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس خطرناک رجحان کو بدلنے اور ہمدردی و دل سوزی سے ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو تعمیر کی طرف لگانے کی بھرپور کوشش ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت کی فکر کرنی چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اعزہ و اقارب، اپنے دوست احباب اور اپنے پڑوسیوں کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھ کر ان کو سدھارنے اور محبت و پیار سے انہیں سیدھی راہ پر لگانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح نئی نسلوں کے مستقبل کے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ جو تعاون بھی ممکن ہو کرنا چاہیے۔

۴- چوتھا اہم ترین کام ــ بھلائیوں کو عام کرنے، رواج دینے اور غالب کرنے کا، اور برائیوں کو دُور کرنے اور مٹانے کا ہے۔ دنیا میں کون ہے جو اپنے لیے برائی کو پسند اور بھلائی کو ناپسند کرتا ہو؟ یا وہ کون سا دین اور مذہب ہے جو برائی کی تعلیم دیتا اور بھلائی سے روکتا اور منع کرتا ہو؟ یا وہ کون سی انجمن، جماعت اور پارٹی ہے جو برائی کو فروغ دینے اور بھلائی کو مٹانے کے نام سے وجود میں آئی ہو؟ آپ کا ایک ہی جواب ہوگا کہ نہیں، کبھی ایسا نہیں دیکھا گیا۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ آج ہمارا معاشرہ برائیوں کو اختیار کرنے میں بے حد جری ہو گیا ہے؟ کیا اس کی فطرت بدل گئی یا وہ آپ اپنی جان کا دشمن بن گیا ہے؟ ایک صاحب کہنے لگے کہ چمڑے کے پرانے جوتے جمع کیے جاتے ہیں، انہیں پکایا جاتا ہے، ان کا برادہ بنایا جاتا ہے۔ پھر انہیں چائے کے رنگ میں رنگ کر چائے میں ملا دیا جاتا ہے پھر وہی ڈبوں میں بھر کر بازار پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہی برادہ چائے کے نام پر ہم اور آپ پیتے ہیں۔ یہ

ایک ادنیٰ مثال ہے ۔ یہی حال تقریباً تمام ہی استعمال کرنے اور برتنے کی چیزوں میں ہو رہا ہے ۔ ملاوٹ، گرانی، قتل وغارت گری، بے حیائی و بدکاری، جوا، شراب نوشی وسود خوری، رشوت ستانی، غرض ہر بڑی برائی کا سیلاب ہے جو پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے ۔

خدا کو بھول جانے، اور شیطان کی پیروی اختیار کر لینے کا انجام ہمیشہ یہی ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے ۔ شیطان ہمارا دشمن ہے ۔ وہ ہمیں برائی سکھاتا ہے اور برائی کی راہ پر ڈالتا ہے ۔ ہماری دنیا بھی تباہ کر دینا چاہتا ہے اور آخرت بھی، وہ ہمارے ہاتھوں کے کرتوت سے دنیا کو بدامنی اور فساد سے بھرا دیکھنا چاہتا ہے تاکہ ہم دنیا میں بھی اس کے کڑوے کسیلے پھل چکھیں اور جب اپنے خدا کے حضور جائیں تو وہاں باغی اور مجرم قرار پائیں، اپنے جرائم کے حقیقی انجام سے دوچار ہوں ۔ وہ انجام انتہائی المناک اور بھیانک ہوگا ۔ دہکتی آگ ہوگی جو چاروں طرف سے چھائی ہوگی، اس سے نکلنے کا موقع نہ ہوگا ۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ بھلائی کا انجام اچھا اور برائی کا انجام برا ہوتا ہے ۔ ہم بھلائیوں کے اختیار کرنے اور برائیوں کے چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیں اور پھر مل جل کر بھلائیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کے مٹا دینے کی منظم کوشش کریں ۔ خدا نے اپنے بندوں کو پیدا کیا ہے اسے ان سے محبت ہے ۔ وہ ہمارے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گا جیسا ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں گے ۔ ہم ان سے محبت کریں گے تو وہ بھی ہم سے محبت کرے گا ۔ رحم کریں گے تو وہ بھی رحم کرے گا ۔ ان کی ضرورت پہ کام آئیں گے تو وہ بھی ہماری ضرورت پہ کام آئے گا ۔ آج بندگانِ خدا کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم انھیں شیطان کے پھندے سے نکال کر انھیں ان کے خدا سے جوڑ دیں ۔ وہ ہوش میں آجائیں ان کے اندر بھلائی برائی کا امتیاز پیدا ہو جائے ۔ وہ بھلائی کو سینے سے لگائیں، برائی سے بھاگیں جیسے کوئی آگ سے بھاگتا ہے ۔ شیطان کی راہ پہ ڈالنے والے بہت ہیں، منظم ہیں، پورے سماج پہ چھائے ہوئے ہیں ۔ خدا کی راہ پہ لگانے والے ٹھیک جائزہ لیں، صحیح صورت حال سے لوگوں کو آگاہ کریں ۔ آج انسانی دل و دماغ پر شیطان نے قابو پالیا ہے انھیں کھلی تباہی کی راہ پہ لگا دیا ہے ۔ وہ پوری تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں ۔ ہر آنے والا دن نئی نئی برائیوں کو جنم دیتا ہے ۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب لوگ عام طور پہ برائی کو

بھلائی اور بھلائی کو بُرائی سمجھیں گے۔ انسانی فطرت مسخ ہو جائے گی اور بھلائی سے ویسی ہی نفرت پیدا ہو جائے گی جیسی بُرائی سے ہونی چاہیے۔ پھر لوگ عام طور پر بھلائی کے نام پر بُرائی کریں گے۔ بھلائی کو بُرائی سمجھ کر چھوڑ دیں گے اور اس طرح ایک دن انسان اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لے گا۔

مسلمانوں پر بحیثیت ملت یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو بُرائیوں کی یلغار سے بچائیں، شیطان کے چنگل سے انہیں بچائیں۔ بُرائی کی آگ پورے ملک اور اس کی ایک ایک آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ انسانی معاشرے کا ہر حصہ دھڑا دھڑ جل رہا ہے۔ ایسے مواقع پر آپ اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھلا دیں۔ ملک کے گوشے گوشے سے اپنے خیر پسند بھائیوں کو ڈھونڈیں، تلاش کریں، انہیں اس آگ کے ٹھنڈا کرنے پر آمادہ کریں۔ متحد اور منظم ہو جائیں۔ پوری قوت کے ساتھ اس محاذ پر ڈٹ جائیں۔ خیر کی ساری بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کریں، ترتیب دیں اور اس کارِ خیر کی انجام دہی میں لگا دیں۔ یہ کام اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ تنہا کوئی ایک جماعت محض اپنے وسائل و ذرائع سے کام لے کر انجام نہیں دے سکتی۔ ضرورت ہے ہر جماعت اور تنظیم، ہر طبقہ اور فرقہ، عوام و خواص سے تعلق رکھنے والے خیر پسند بھائی اس کام کے لیے ایک ہو جائیں۔ باہمی اشتراک و تعاون سے کام لیتے ہوئے ایک عظیم اجتماعی قوت بنیں اور کام کو کما حقہٗ انجام دیں۔ اس کام کو ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ ہمارے دلوں میں خدا کا ڈر ہو، محبت ہو، اُسے راضی کرنے اور خوش کرنے کی تڑپ ہو، آخرت میں اپنے خدا کے حضور جواب دہی کا احساس ہو۔ اس کے بغیر مال کی ہوس اور شیطان کے بہلاوے سے نجات پانا مشکل ہے۔

آج اس گئے گذرے دور میں بھی ہمارے ملک اور معاشرے میں خیر پسند بھائیوں کی کمی نہیں ہے، آپ شہروں کی سربفلک عمارات سے لے کر دیہات کی ایک خستہ جھونپڑی تک، ہر گھر میں جھانک کر دیکھیں۔ آپ کو ایک بہت بڑی تعداد ملے گی جو نیکی اور بناؤ کو دل سے پسند کرتی ہے، بُرائی اور بگاڑ سے اُسے شدید نفرت ہے۔ یہی انسان کی فطرت ہے۔ ابھی ان کی فطرت بدلی نہیں ہے۔ لیکن یہ سب کے سب منتشر ہیں، بکھرے ہوئے ہیں، برائی اور بگاڑ کے بڑے، ہمہ گیر اور بھیانک طوفان کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے ہیں۔ ڈرے، سہمے اور مبہوت کھڑے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ اس طوفان

سے اپنا بچاؤ کیسے کریں؛ مادی تعمیر و ترقی، معیارِ زندگی کی بلندی، دولت بڑھانے، اقتدار پر قبضہ پانے ملکی وسائل کو ہاتھ میں لینے اور حسبِ منشا استعمال کرنے کی آوازیں ہر طرف سے اُٹھ رہی ہیں۔ ان کے لیے تنظیمیں بنتی ہیں، پارٹیاں وجود میں آتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے اور لذاتِ دُنیا سے لطف اندوز ہونے کی ایک ہوا چل رہی ہے۔ ہر فرد ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی فکر میں ہے۔ اس لیے دھینگا مشتی، اکھاڑ پچھاڑ، اور ایک دوسرے کو گرانے اُٹھانے کا ہنگامہ برپا ہے۔ لیکن نیک نیتی کے ساتھ محض نیکی اور بناؤ کو پروان چڑھانے اور بُرائی اور بگاڑ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے وسیع پیمانے پر کوئی منظم کوشش نہیں ہو رہی۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر خیر پسندوں کی رُوح لرزتی ہے اور وہ دن بدن مستقبل سے مایوس ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس موقع پر اگر آپ آگے بڑھیں، سکوت توڑیں، نیکی اور بناؤ سے محبت رکھنے والوں کو آوازیں دیں۔ انھیں اطمینان دلائیں کہ ہم خدا کے واسطے اس نیکی اور بناؤ کو فروغ دینا چاہتے ہیں جو آپ کے دل کی آواز ہے اور جس سے آپ کو قلبی لگاؤ ہے۔ اُس بُرائی اور بگاڑ کو مٹانا چاہتے ہیں جس سے آپ کی فطرت انکار کرتی ہے اور جس سے آپ کو شدید نفرت ہے۔ اس کے سوا اور ہماری کوئی غرض نہیں ہے کہ ہم سے ہمارا خدا راضی اور خوش ہو۔ ہمیں اور تمام ہی بندگانِ خدا کو دنیا میں بھی امن چین اور انصاف نصیب ہو اور اپنے خدا کے حضور بھی ہم خیر پسند اور نیکوکار بن کر پیش ہوں۔ وہ ہمیں اپنے لازوال انعامات سے نوازے، اس کی پکڑ اور دردناک سزا سے ہم بچ جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارا ایک عزم، ایک مقصد اور ایک کام ہو۔ اس کے لیے ہم پورے ملک میں تحریک چلائیں، مہم لے کر اُٹھیں، انجمنیں، جماعتیں اور پارٹیاں بنائیں۔ ہر خیر پسند کو اپنے ساتھ لیں، ہر جگہ ایک اجتماعی طاقت بن کر کھڑے ہو جائیں۔ بُرائی اور بگاڑ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ نیکیوں اور بھلائیوں کا ایک سیلاب ہو۔ جو بُرائیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے۔ آپ خیر پسندوں کے اندر اُمنگ اور حوصلہ پیدا کریں۔ ان کے خوف و ہراس کو دُور کریں ان کی مایوسیوں کو اُمید سے بدل دیں۔ انھیں محسوس ہونے لگے کہ خدا کے حق پرست نیکوکار بندوں نے جھرجھری لی ہے۔ بیدار ہو رہے ہیں۔ اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں سے گلے مل رہے ہیں۔ سینے سے لگا رہے ہیں۔ دلوں کے میل کچیل دھل رہے ہیں۔ باہمی شکوہ و شکایت کا دور ختم ہو رہا ہے۔ سب ایک خدا کے بندے، ایک ماں باپ کی اولاد تھے۔ بچھڑ گئے تھے۔

پھر ایک ہو رہے ہیں۔ یہ حق پرستی اور نیکی کے علمبردار ہوں گے۔ منظم ہوں گے۔ حرکت میں آئیں گے۔ ایک دوسرے کو سہارا دیں گے ڈھارس بندھائیں گے۔ آگے بڑھیں گے۔ ملک، معاشرہ اور ایک ایک گھر کو نیکیوں سے بھر دیں گے۔ حق اور نیکی کا سورج پوری آب و تاب سے روشن ہوگا۔ باطل، جھوٹ اور برائی کی گھنگھور گھٹائیں چھٹ جائیں گی۔ ہوائیں تحلیل ہو کے رہیں گی۔ آپ کی آواز میں زور ہو، آپ کی پشت پر عظیم اجتماعی طاقت ہو، تو آپ دیکھیں گے کہ ملک کے گوشے گوشے سے خیر پسند فوج در فوج کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ آپ کو ملک کے جنگل و بیابان سے بھی اپنی تائید ملے گی۔ حق اور نیکی میں بے پناہ طاقت اور کشش ہے۔ ایک مرتبہ آپ اسے بے نقاب کر کے میدان میں لے آئیں۔ پھر دیکھیں کہ جھوٹ، برائی اور بگاڑ کس طرح میدان چھوڑتے ہیں۔

یہ ہیں وہ چند اہم کام جو اپنی انجام دہی کے لیے ہماری غیر معمولی توجہ چاہتے ہیں۔ جماعت اسلامی انہیں زیر عمل لانے کے لیے کوشاں ہے۔ مگر اس طرح کے ملک گیر کام تنہا کسی ایک گروہ کی محدود کوششوں سے انجام نہیں پا سکتے بلکہ ملک کے جملہ بہی خواہ اور خیر پسند حضرات کی اجتماعی کوششوں ہی سے کچھ ہو سکے گا۔ تنہا کوئی جماعت یا گروہ انہیں کامیابی کے ساتھ سرانجام نہیں دے سکتا۔

پاکستان میں زکوٰۃ کی متوقع آمدنی

چند توجہ طلب مسائل

اے ۔ جے ۔ عمر

اکتوبر ۷۸ء کے ترجمان القرآن میں جناب ابو العرفان صاحب کا مضمون "پاکستان میں زکوٰۃ کی متوقع آمدنی" اشاعت پذیر ہوا ہے۔ یہ مضمون اس اعتبار سے بہت قابلِ قدر ہے کہ جناب مصنف نے پاکستان میں بیشتر اعداد و شمار کے ذرائع سے استفادہ کیا ہے اور ان ذرائع سے جو ممکنہ تخمینہ لگایا جاسکتا تھا وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب رہے ہیں۔ موصوف کی یہ بات بھی بہت حد تک درست ہے کہ زکوٰۃ کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اعداد و شمار جمع کرنے اور انہیں شائع کرنے کا انداز بھی از سرِ نو استوار کرنا ہوگا۔ کیونکہ موجودہ ذرائع کچھ اور مقاصد کے پیش نظر اعداد و شمار شائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ہماری رائے میں اس کام کے لیے دو چار افراد پر مشتمل کسی ٹیم کو اعداد و شمار جمع کرنے، انہیں ضرورت کے مطابق ڈھالنے کا طویل اور محنت طلب کام سپرد کرنا چاہیے۔

ابوالعرفان صاحب نے جو اعداد و شمار فراہم کیے ہیں وہ سرکاری ذرائع سے حاصل شدہ ہیں لہٰذا ان کی صداقت پر گفتگو کرنا زیادہ سود مند نہیں ہوسکتا۔ البتہ جس طریقہ (METHODOLOGY) سے یہ اعداد و شمار استعمال کیے گئے ہیں اور جو نتائج ان سے نکالے گئے ہیں ان میں چند باتیں محل نظر ہیں۔ جن کو ہم ترتیب وار درج کرتے ہیں۔

۱۔ سب سے اہم مسئلہ "اموال تجارت" پر زکوٰۃ کا ہے۔ ابوالعرفان صاحب نے "اموالِ تجارت کی مالیت" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس سے ان کی مراد واضح نہیں ہوتی، یعنی کیا ان کی مراد سٹاک

(STOCK — IN — TRADE) ہے؟ یا وہ تمام سرمایہ جس سے کاروبار کیا جا رہا ہے؟ اُن کے تجزیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ "تجارتی اموال سے مراد کاروباری سرمایہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ اموالِ تجارت سے مراد تجارتی مال یعنی (STOCK-IN-TRADE) ہوتا ہے، کسی کاروبار میں دیگر اثاثہ جات پر زکوٰۃ نافذ نہیں ہوتی، یعنی عمارت، زمین، مشینری، فرنیچر وغیرہ۔ لیکن ہم جمہور کی اس رائے پر اجتہاد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ابوالعرفان صاحب کی یہ رائے کہ تجارتی اموال سے مراد تمام اثاثہ جات ہیں زیادہ صائب ہے۔ بہرحال ابوالعرفان صاحب کو یہ موقف واضح طور پر بیان کرنا چاہیے تھا۔

ابوالعرفان صاحب نے تجارتی اموال پر شرح نصاب تین لاکھ روپے فرض کی ہے اس کی بنا سمجھ میں نہیں آسکی، تجارتی اموال کا نصاب وہی ہے جو کہ نقد سرمایہ کا ہوتا ہے یعنی ۵۲ تولے چاندی یا ۷½ تولے سونا۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ چونکہ چاندی والا نصاب زیادہ معتبر روایات سے ہم تک پہنچا ہے لہٰذا تجارتی اموال کی شرح نصاب ۵۲ تولے چاندی پر ہونی چاہیے۔ اگر یہ بات تسلیم کی جائے تو ہر وہ کاروبار جس کا سرمایہ زیادہ سے زیادہ ہزار روپے ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ لیکن اگر سونے کا نصاب مانا جائے تو بھی حد نصاب ۴۵۰۰/- روپے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایسی صورت میں بھی شاید ہی کوئی کاروبار ہو جس پر زکوٰۃ نہ لگے۔ ممکن ہے خوانچہ فروش بچ جائیں۔

ابوالعرفان صاحب نے جو تخمینہ لگایا ہے اس میں ایک اور بات بھی محل نظر ہے مثلاً انہوں نے تمام زکوٰۃ کے قابل تجارتی اموال کو جمع کر لیا ہے، ہم سمجھتے ہیں اس سے اُن کی مراد کاروباروں کے تمام اثاثہ جات (ASSETS) ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اثاثہ جات میں کاروباروں کی بچتیں، اُن کی نقد رقوم اور ان کے حصص اور بانڈز میں سرمایہ کاری بھی شامل ہے۔ لہٰذا جب تمام کاروباری اموال پر (یعنی اثاثہ جات پر) زکوٰۃ کا حساب لگ گیا تو پھر حصص، بانڈز، بنکوں میں جمع رقوم اور نقدی پر زکوٰۃ کا حساب لگاتے وقت کاروباری طبقہ کی رقوم کو منہا کرنا لازم ہے ورنہ وہ دو بار شمار ہو جائیں گے، موصوف نے ایسا نہیں کیا، لہٰذا ان مدوں کی حد تک ان کا تخمینہ دوہرے شمار کا حامل ہے جس کو از سرِ نو جانچنا ہوگا۔

اب مسئلہ اِن اموال پر زکوٰۃ کا اندازہ کرنے کا ہے۔ بلاشبہ موجودہ حالات میں یہ ایک جان جوکھوں کا کام ہے اور جب تک اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے محنت نہ کی جائے کوئی قابلِ اعتماد تخمینہ لگانا مشکل ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ اِس کام کے لیے کسی ٹیم کو یہ کام لمبے عرصے کے لیے کرنا ہوگا۔ ہمارے خیال میں اِس کام کو انجام دینے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے۔

اوّل یہ کہ پورے ملک میں تمام کاروباروں کا جامع گوشوارہ تیار کیا جائے جسے سرمایہ کے اعتبار سے مختلف مدات (CATEGORIES) میں بانٹ دیا جائے، مثال کے طور پر ۱۰۰۰/- روپے سے لے کر ۵۰۰۰/- روپے تک کے سرمایے کے کتنے کاروبار ہیں۔ پھر ۵۰۰۰/- روپے سے ۱۰۰۰۰/- روپے تک کے کتنے، اِسی طرح ۱۰۰۰۰/- روپے سے ۲۰۰۰۰/- روپے ...... علیٰ ہذا القیاس، کروڑوں تک کے کاروبار کی مختلف مدات بنائی جائیں۔ پھر ہر مد کا مجموعی سرمایہ نکالنا ممکن ہوگا۔ جو کہ اس کے اوپر اور نیچے والی حد کی اوسط سے ضرب دے کر کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ۱۰۰۰ سے ۵۰۰۰ تک کی حد میں ۴۰۰۰۰۰ کاروبار ہیں تو ان کو ہم ۳۰۰۰ ($\frac{1000 + 5000}{2} = 3000$) سے ضرب دے کر مجموعی سرمایہ ایک ارب اور بیس کروڑ کہہ سکتے ہیں۔ یہ کام انفرادی تحقیق کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر مختلف شہروں کے گروپ آبادی کے حساب سے بنائے جائیں اور ہر گروپ میں سے ایک یا دو شہروں کا تخمینہ اِس تفصیلی عمل کے ذریعہ لگایا جائے اور اس گروپ کے باقی شہروں کے لیے اسی رقم کو اوسط تسلیم کر لیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر ایک گروپ میں پانچ شہر ہیں اور ایک شہر میں عملی کام کر کے مجموعی تجارتی اموال کی کوئی رقم نکال لی جائے۔ پھر اس کو پانچ سے ضرب دے دیا جائے تو اس گروپ کے تجارتی سرمایہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے شہروں کی موجودہ انتظامی تقسیم بھی کوئی ضروری نہیں ہے، بلکہ صنعتوں اور کاروباری مراکز کے ارتکاز کے حساب سے نئے حلقے بنائے جا سکتے ہیں۔ اور اِس طرح ہر حلقے کے ایک نمائندہ یونٹ کا عملی جائزہ لیا جائے بعد ازاں اِس کو اعداد و شمار کے ماہرین غلطیوں اور شماریاتی تعصب (STATISTICAL BAIS) سے پاک کر لیں۔ ہماری رائے میں یہ ایک بہت تفصیلی کام ہے لیکن اگر کوئی تنظیم اس کام کا بیڑا اٹھائے تو انشاء اللہ اس سے مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

۲۔ زرعی زکوٰۃ کے سلسلے میں جناب ابوالعرفان صاحب نے پانچ وسق نصاب کی بات تو ضرور

کی ہے لیکن بعد میں تخمینہ لگاتے وقت اس کو محسوب نہیں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عبداللہ المسدوسی کی کوشش قابل قدر ہے انہوں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے اہلِ علم کو چاہیے کہ اُسے بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ دسق کے وزن کے بارے میں مفتی شفیعؒ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ ایک وسق پانچ من اور ۲ ۱/۲ سیر کا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ۵ وسق ۲۵ من اور ۱۲ ۱/۲ سیر کے ہوئے (مفتی محمد شفیع صاحب اوزان شرعیہ کراچی، دارالعلوم ۱۳۹۱ ہجری)۔

غلہ کے کھیت یا باغ کی فروخت کے بارے میں ابوالعرفان صاحب نے لکھا ہے: "اگر خرید و فروخت کھیتی کے تیار ہونے اور پھلوں کے پک جانے سے قبل طے پاتی ہے تو زکوٰۃ خریدار ادا کرے گا......" حالانکہ یہ بات تقریباً حدیث کی تمام کتابوں میں منقول ہوئی ہے کہ ایسی بیع جائز نہیں جب تک پھل پک نہ جائیں۔ کسی روایت میں ہے کہ وہ کھانے کے قابل نہ ہو جائیں۔ کسی میں ہے کہ جب تک سرخ نہ ہو جائیں وغیرہ۔ لہٰذا موصوف کی اوپر والی رائے ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔

اسی طرح موصوف لکھتے ہیں: "ان اعداد و شمار کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۶۰ فیصد زیر کاشت رقبہ نہری زمینوں پر مشتمل ہے۔ باقی ماندہ میں سے ۲۰ فیصد بارانی ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ۸۰ فیصدی رقبہ وہ ہے جس پر عشر عائد ہوتا ہے اور ۲۰ فیصد رقبہ وہ ہے جس پر نصف عشر واجب ہے"۔ اس سلسلہ میں ایک تو ۲۰ فیصد کا تخمینہ بالکل سرسری ہے اور اس کی کوئی بنیاد نہیں بتائی، دوسرے یہ بات کہ نہری زمینوں والے لوگ آبیانہ بھی ادا کرتے ہیں تو کیا ان کو اس میں کوئی چھوٹ ملے گی یا نہیں؟

۳۔ پراویڈنٹ فنڈ اور انشورنس: پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا تخمینہ لگانے کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ گورنمنٹ یا دوسرے تمام وہ ادارے جو پراویڈنٹ فنڈ کی سہولت فراہم کرتے ہیں، ان سے سالانہ آخری ادائیگیوں (FINAL PAYMENTS) کی مجموعی رقم معلوم کی جائے۔ گورنمنٹ کے اعداد و شمار متعلقہ اکاؤنٹس آفیسر سے پتہ چل سکتے ہیں۔ پرائیویٹ اداروں کے لیے عملی تحقیق کی ضرورت ہوگی۔ ان آخری ادائیگیوں پر ۲ ۱/۲ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ کا حساب کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تمام انشورنس کمپنیوں سے یہ پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر انہوں نے کتنی رقوم پالیسی پوری ہونے اور کتنی رقوم (SURRENDER VALUE) کے طور پر ادا کی ہیں

ان کے مجموعہ پر زکوٰۃ کا مجموعی تخمینہ لگایا جاسکتا ہے۔

۴۔ مویشیوں کی زکوٰۃ: جناب ابوالعرفان صاحب نے ٹھیک فرمایا ہے کہ اس سلسلے میں اعداد و شمار بالکل موجود نہیں ہیں۔ اس کام کے لیے بھی فیلڈ ورک کی ضرورت ہے۔ تمام ملک کو مختلف منطقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پھر ہر منطقے کے ایک نمائندہ یونٹ کی اوسط عملی تجزیہ کے ذریعہ پتہ کی جائے۔ یہ کام تجارتی اموال پر اعداد و شمار جمع کرنے کے مشابہ ہوگا۔

اسلامی نظامِ تعلیم کا مقصد

پروفیسر محمد سلیم صاحب

(۲)

نظریہ خلافت کے تحت جب افراد کی نئی ذہنی تشکیل ہوتی ہے تو نئے قسم کا معاشرہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ ہدایت الٰہی کی رہنمائی میں پروردہ افراد مغرب کے لادینی اور بے قید معاشرہ کے افراد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے بندے ہوتے ہیں، وہ رحمدل اور خداترس ہوتے ہیں، وہ ضبط نفس پر کاربند ہوتے ہیں، وہ خوش اخلاق اور ہمدرد ہوتے ہیں، وہ حسن عمل اور حسن کردار کے مجسمہ ہوتے ہیں، وہ ہردم دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اکل حلال اور کسب حلال پر عامل ہوتے ہیں۔ ادائے حقوق عباد پر متوجہ رہتے ہیں۔ مصیبتوں اور تکلیفوں پر صبر کرتے ہیں۔ تسلیم و رضا کے خوگر ہوتے ہیں۔ ہر معاملہ میں امین اور دیانت دار ہوتے ہیں۔ ان کو دنیا میں ہی نفس مطمئنہ کی نعمت حاصل ہو جائے گی۔

ایسے افراد سے مل کر جو معاشرہ قائم ہوتا ہے، وہ با اخلاق اور فلاحی معاشرہ ہوتا ہے۔ وہاں امن و امان ہوتا ہے۔ وہاں افراد کو سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر فرد کو فکر و عمل کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ تاہم وہ معاشرہ کے اجتماعی مقاصد کا محافظ ہوتا ہے۔ وہاں نیکیاں فروغ پاتی ہیں اور برائیاں مٹ جاتی ہیں۔ معاشرہ خود ہی کفالت عامہ کے طریق پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ عدل اجتماعی پر کاربند ہوتا ہے۔ وہاں افراد کے حقوق محفوظ ہوتے ہیں۔ صحیح معنوں میں ایک صالح معاشرہ اور ایک صالح تمدن وہاں برپا ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں انسان "حیات طیبہ" کی نعمتوں سے مستفید ہوتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلامی نظامِ تعلیم

کا مقصد ہے ۔

۱۔ انسانوں کو انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے خلافت کے فرائض ادا کرنے کے قابل بنانا ہے۔

۲۔ انسانوں کو وہ علمی، عملی اور اخلاقی تعلیم اور تربیت دینی ہے کہ وہ منصب خلافت کے اہل ہو سکیں ۔

۳۔ ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جہاں افراد کو طمانیت قلب حاصل ہو اور معاشرہ حیات طیبہ کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو۔

۴۔ اسلامی معاشرہ قائم کرنا ہے اور اسلامی معاشرہ کو مردان کار مہیا کرنا ہے۔

۵۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق رضائے الٰہی کا حصول ہے تاکہ انسان آخرت میں مالک حقیقی کے سامنے سُرخ رُو ہو سکے ۔

اسلامی نصابیات کے اصول بھی تصورِ خلافت سے ہی مستنبط ہیں۔ خلافت کے تصور میں تین حقیقتیں پنہاں ہیں۔ اللہ، انسان اور زمین۔ خلافت کے فرائض کا تعلق ان تین حقیقتوں سے ہے۔ اسلامی نصاب تعلیم کا تعلق بھی ان تین حقیقتوں سے ہے۔

۱۔ بنیادی طور پر انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا معلوم کرنا اس کے بنیادی فرائض میں داخل ہے تاکہ اس رہنمائی کی روشنی میں وہ اپنی زندگی اس طرح بسر کرے کہ خلافت کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا انسان کی زندگی کا منتہائے مقصود ہے۔ رضائے الٰہی معلوم کرنے میں مجرد عقل ناکام اور عاجز ہے۔ یہاں وحی الٰہی دستگیری کرتی ہے۔ عقل و وحی میں تضاد نہیں ہے جیسا کہ مغرب کے حکماء کو غلط فہمی لاحق ہو گئی ہے۔ بلکہ وحی سے عقل کی تکمیل ہوتی ہے۔ وحی عقل کے لیے صحیح دائرہ کار مقرر کرتی ہے۔ وحی الٰہی کی آخری کتاب قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی

لے انسانوں کے وضع کردہ مقاصد تعلیم کے مقابلہ میں اسلامی تعلیمی مقاصد آفاقی اور عالمگیر ہیں۔ وہ گروہی اور وطنی اعتراض سے پاک ہیں۔ وقتی اور ہنگامی مقاصد سے بلند و برتر ہیں۔ اس نظامِ تعلیم کی بنیاد وحدتِ خالق، وحدتِ مخلوق، اور آخرت کی جواب دہی جیسے ازلی اور ابدی اصولوں پر قائم ہے۔ زمان و مکان، اقوام و ادکان کی قیود و حدود سے یہ بالا ہیں۔ ان سے سیراب ہو کر نگاہ وسیع اور قلب فراخ حوصلہ ہو جاتا ہے۔

کے علم کو عام کر دیا ہے۔ آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت الٰہی کا بہترین عملی مظاہرہ اپنی زندگی میں پیش کر دیا ہے۔ انسانوں کے لیے صحیح صراط مستقیم بتا دی ہے۔ اب اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا واحد راستہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں منحصر ہے۔

خلافت کے فرائض ہدایت الٰہی سے معلوم ہوتے ہیں اور سنت رسول سے ان کی عملی تشکیل ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا سیکھنا اور سکھانا ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق علم دین —— ہدایت الٰہی —— کا سیکھنا بھی عبادت ہے اور اس کا سکھانا بھی عبادت ہے۔ درس و تدریس میں مشغول استاد و شاگرد عبادت الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ کوئی دنیوی غرض اور منفعت ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ دونوں دینی جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ذہنی کیفیات یکسر تبدیل ہو جاتی ہیں۔ استاد سراپا رحمت اور شفقت بن جاتا ہے۔ طالب علم سراپا خلوص اور فرمانبرداری بن جاتا ہے۔ آج کی لادینی درس گاہوں کے ماحول میں یہ طرز عمل کتنا اجنبی اور بعید نظر آتا ہے۔

دوسری اقوام کے نزدیک علم کا مفہوم صرف "علم الاشیاء" تک محدود ہے۔ یہ معاشرتی علوم، یہ سائنسی علوم سب علم الاشیاء کی تفسیریں ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک علم کا حاصل کرنا نہ زندگی کی ضرورت ہے نہ لازمہ حیات ہے بلکہ محض تزئین و تحسین حیات ہے۔ اسلام کے نزدیک علم فی الحقیقت علم ہدایت ہے۔ اس کے نزدیک علم دین حاصل کرنا زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ علم دین حاصل کرنا لباس اور خوراک سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ لباس و خوراک بقائے جسم کا ضامن ہے۔ علم دین اخلاق اور روحانیت کا ضامن ہے۔ جس کے تحفظ کے بعد ہی وہ حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جو انسان کا مقام کائنات میں متعین کرتا ہے۔ اس کی عظیم ذمہ داریوں سے اس کو آگاہ کرتا ہے۔ اس کی بے پناہ صلاحیتوں اور توانائیوں کے لیے صحیح میدانِ عمل تجویز کرتا ہے۔ اس سے بے بہرہ رہنا حیوان رہنے کے مترادف ہے۔ اس لیے علم دین کا حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض عین ہے۔ سب سے پہلے اسلام نے دنیا میں تحصیل علم کو لازمی قرار دیا ہے۔

ہدایتِ الٰہی یا علم دین کلام الٰہی اور سنتِ رسول سے عبارت ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق قرآن اور سنت نے واضح ہدایات دی ہیں۔ علمائے کرام نے سہولت کی خاطر ان ہدایات کو چند بڑے بڑے عنوانات کے تحت جمع کر دیا ہے۔ عقائد، عبادات، معاملات (علوم معاشرت) جرم و سزا

(قوانین) آداب معاشرت، احسان واخلاص۔ اختصار کے طور پر ان تعلیمات کو شریعت کے جامع لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسانی زندگی کے لیے اس شریعت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ عقل انسانی اپنی محدودیت کی بنا پر ایک فرد کے تمام مصالح اور ذرائع حصول مصالح کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ معاشرہ یا نوع بشر کے مصالح زمان و مکان کی وسعتوں میں احاطہ کرنے سے بدرجۂ اولی عاجز ہے۔ یہ عظیم کام اس کی بساط سے باہر ہے۔ عقل انسانی آئے دن سابق قانون کو منسوخ اور جدید قانون کو نافذ کرتی رہتی ہے۔ یہ ہر دم کا تغیر اس کی عدم رسائی حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ انسانی وسائل کو جاننے والے علیم و خبیر خداوند تعالیٰ نے یہ ہدایت اپنے برگزیدہ نبی کے ذریعے تمام انسانوں کو عطا کر دی ہے۔ اس ہدایت میں افراد، معاشرہ اور نوع کے مادی، جسمانی، اخلاقی، روحانی تمام تقاضوں اور مصالح کو بڑی گہرائی سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس وجہ سے شریعت پر عمل پیرا معاشرہ میں نہ اضطراب ہے نہ اختلال ہے نہ ہی باہمی تصادم۔ بلکہ امن و سکون اور طمانیت کا ضامن ہے۔ یہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر چل کر تمام انسان منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ ہدایت انسانوں کے تمام دکھوں کا مداوا ہے۔ اکسیر اعظم ہے۔ اس لیے اس کا سیکھنا سکھانا فرض عین ہے۔ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے یہ ہدایتی حصہ —— شریعت کی تعلیم —— اسلامی نصاب تعلیم کا اولین جزو ہے۔

۲۔ انسان کو خلافت کے فرائض انسانوں کے معاشرہ میں انجام دینے ہیں۔ اس لیے افراد اور معاشرہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا اس کام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ تاکہ وہ بہتر طریقہ پر معاملہ کر سکیں۔ انسانوں کی کد و کاوش نے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں جو معاشرتی علوم ترتیب دیے ہیں اور معلومات بہم پہنچائی ہیں، وہ سب قابل قدر ہیں۔ اسلام ان کوششوں کو نہ رد کرتا ہے اور نہ ان کی تنقیص کرتا ہے۔ دنیا کی کسی قوم سے اسلام کو نفرت نہیں ہے۔ نہ کسی علم سے تعصب ہے۔ اسلام وحی و ہدایت کا دین ہے۔ زمان و مکان کے تعصبات سے بالا ہے۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ معلومات کے اس ذخیرہ میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔ ان کو حق کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے تاکہ حق باطل سے چھٹ کر جدا ہو جائے۔ اس لیے ان علوم کی ترتیب اور تدوین جدید کی ضرورت ہے۔ اخذ و ترک اور اصلاح ہدایت الٰہی کی روشنی میں کرنا ہے۔ اس طرح منقح اور مصفی کرنے کے بعد ان علوم کو وہ اپنے

نصاب میں شامل کر لینا ہے۔ اسلامی نصاب کا دوسرا جزو علوم عمرانی ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، معاشیات عمرانیات، سیاسیات، نفسیات، نذر لسانیات، فلسفہ وغیرہ۔ علوم ہدایت کے بعد علوم عمرانی کی اہمیت دوسرے درجے پر ہے۔

۳۔ خلافت کے فرائض انسان کو اس دنیا میں انجام دینے ہیں۔ یہاں اس کو ایک معاشرہ اور ایک صالح تمدن برپا کرنا ہے۔ زمین کی نعمتوں اور اس میں مدفون خزانوں سے انسانوں کی زندگی کو مالا مال کرنا ہے۔ منصب خلافت پر فائز کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السّلام کو علم اشیاء عطا کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو فرشتوں پر برتری حاصل ہوئی تھی۔ یہ اسی جانب اشارہ تھا۔ اس لیے تمام زمینی علوم مادی علوم ــــ کا مطالعہ ضروری تھا۔ اسلام سائنسی علوم کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ بلکہ سائنسی نقطۂ نظر دنیا کو اسلام نے ہی دیا ہے۔ سائنس کے کسی انکشاف سے اسلامی تعلیمات کو کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہے وہ خلق اللہ ہے یہ کلام اللہ ہے۔ اس لیے طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، ارضیات، فلکیات وغیرہ کا علم فرائض خلافت کے ادا کرنے میں ممد و معاون ہے۔ ان کا جاننا اور سیکھنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح فنی اور ٹیکنیکل علوم میں مہارت حاصل کرنا بھی ناگزیر ضرورت ہے۔ ڈاکٹر، انجینیئر، صناع، ماہرین فنون اسلامی معاشرہ کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ البتہ ان سب کو ہدایتِ الٰہی کی روشنی میں سنوارنا ضروری ہے۔ ان میں سے بعض کا لادینی لبادہ اُتار کر (انہیں) موزوں لباس مہیا کرنا ہو گا۔ اسلامی نصاب کا یہ تیسرا حصہ ہے۔

ان علوم کی باہمی قدر و قیمت اور درجہ بندی بھی اسلام نے مقرر کر دی ہے۔ انسان، کائنات اور خداوند تعالیٰ تین واضح حقیقتیں ہیں۔ ان کے مابین تعلقات اور روابط کی نوعیت بھی دائمی ہے۔ کسی تغیر اور اضافہ کا اس میں امکان نہیں ہے۔ یہ روابط اور تعلقات ہدایت الٰہی کے بتاتے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہدایتی حصہ دائمی اور ناقابلِ تغیر ہے۔ ہر ملک میں اور ہر دور میں یہ مسلمانوں کی تعلیم کا اوّلین جزو رہا ہے۔ علوم ہدایت کا حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض عین ہے۔ یعنی ایک ایک مسلمان اس بات کا مکلف ہے کہ وہ علم دین حاصل کرے۔ اگر وہ یہ علم حاصل نہیں کرے گا یا کوتاہی برتے گا تو گنہگار ہو گا۔ اور ساتھ ہی وہ مسلمان معاشرہ بھی گناہ کا مرتکب قرار پائے گا جس میں ایسے نادان مسلمان پائے جاتے ہیں۔

علوم عمرانی اور علوم سائنس سب انسان کی محنت سے پروان چڑھے ہیں۔ آئندہ بھی اس میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ ترقی پذیر اور تغیر پذیر ہیں۔ اسلام جدید ترین معلومات حاصل کرنے میں کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہے۔ ان علوم کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان علوم کے جاننے والے ہر مسلمان ملک میں اور ہر زمانے میں ایک معقول تعداد میں موجود رہنے چاہییں۔ اگرچہ ایک ایک فرد کے لیے ان کا جاننا کچھ ضروری نہیں ہے۔ لیکن اگر معاشرہ میں کوئی ایک شخص بھی ان علوم سے واقف کار نہ باقی ہو تو پھر وہ پورا معاشرہ گناہ کا مرتکب قرار پائے گا۔

قدیم اسلامی مدارس کی اصطلاح میں ہدایتی حصّہ کو علوم منقول کہا جاتا ہے۔ یہ علوم وحی الٰہی اور سنتِ رسول سے حاصل کردہ ہیں۔ علوم عمرانی اور علوم سائنس کو علوم معقول کہا جاتا ہے۔ یہ علوم عقلِ انسانی کی کوششوں سے مدون ہوتے ہیں۔ اسلامی نصابِ تعلیم ہر دور میں علوم منقول اور علوم معقول ——— منقولات اور معقولات ——— سے مل کر ترتیب پاتا رہا ہے۔

اب ذرا ایک نظر موجودہ دور کے قدیم اور جدید مدارس پر بھی ڈالنا چاہیے۔ قدیم مدارس میں صدیوں سے جمود طاری ہے۔ معقولات میں وہی یونان زدہ قدیم علوم پڑھائے جا رہے ہیں۔ اگرچہ زمانہ اب یونانی علوم کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ علوم منقول کو بھی جدید اسلوبِ بیان اور ترتیب میں پیش کیا جائے۔ ان کو زندہ علوم کی طرح پڑھایا جائے اور علوم معقول میں جدید علوم کا اضافہ کیا جائے۔ اسکولوں اور کالجوں کا حال اور بھی ابتر ہے۔ علوم منقول کا تو وہاں سرے سے گزر ہی نہیں۔ ہدایتی حصّہ کو تو وہاں داخلہ ہی نہ مل سکا۔ علوم معقول بھی اہل مغرب سے لے کر جوں کے توں پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ بہرکیف ضرورت شدید اس امر کی ہے کہ اسلامی نظامِ تعلیم و تدریس کو از سرِ نو اسلامی خطوط پر مرتب کیا جائے۔ مخلص اور وسیع النظر مسلمان اہل علم جدید نصاب کو ترتیب دیں۔ جس طرح امام غزالی اور سعید الدین تفتازانی اپنے دور میں یہ فریضہ انجام دے چکے ہیں۔

رُوداد ابتلاء : احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۷)

ملا نے میجر ف ۔ ع سے کہا کہ اس پر مجھے کوئی اعتراض یا جھجک نہیں ہے کہ کچھ نئی باتوں کا مجھ سے اقرار کروا لیا جائے اور میں اس اقرار نامے پر بھی دستخط کر دوں گا ، لیکن کیا سابقہ بیانات کافی نہیں ہیں ؟ میجر غیظ و غضب سے بھری ہوئی آواز میں بپھر کر بولا : " اے ابن الکلب ! کیا ہم بیانات میں ردّ و بدل کیا کرتے ہیں ؟ ہم اصل حقائق معلوم کرنا چاہتے ہیں " اس کے بعد میرے سامنے کوئی چارہ نہ تھا ماسوائے اس کے کہ میں اپنے آپ کو تعذیب و تشدد کے سپرد کر دوں ۔ اور میرے جسم کے مختلف حصوں میں جلتے ہوئے سگریٹ بجھائے جائیں ۔ سگرٹوں کے داغ سے عرصہ دراز تک میرا چہرہ بگڑا رہا ——

مزید ستم یہ ہوا کہ ہمارے ایک اور دوست گرفتار کر لیے گئے ۔ یہ صاحب بڑے ڈرپوک تھے ، اور معمولی سے معمولی چیز سے اُن کا دل دھڑکنے لگ جاتا تھا ۔ مبیّنہ سازش کی کہانی تصنیف کرنے میں انہوں نے بھی مدد بہم پہنچائی ۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ صفائی پیش کرنے کا کوئی حاصل بھی نہ تھا ۔ بلکہ ہم پر لازم تھا کہ ہم عذاب سے نجات پانے کے لیے دروغ گوئی میں زیادہ سے زیادہ مہارت اور پختگی دکھائیں ۔ یعنی اتنا اقرار کافی نہیں ہے کہ فی الواقع ہم نے سازش میں حصہ لیا ہے ۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ سازش کے تمام واقعات باہم مربوط و ہم آہنگ ہوں اور ایک کڑی دوسری کڑی سے بڑی عمدگی کے ساتھ ملتی جائے ——— اس لاحاصل مقصد کی خاطر کئی انسان نذرانۂ جان پیش کر گئے ۔

اربابِ تفتیش کی زبان پر یہ فقرہ ہر نظر بند کے لیے جاری رہتا تھا کہ : " تیری موت آ چکی ہے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔ لیکن مرنے سے پہلے تجھے کچھ نہ کچھ بتانا ضرور ہو گا " میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ ان عالم

کی حفاظت کرنے والے تمام ادارے تمام قوم کو اس نگاہ سے دیکھتے تھے کہ یہ پوری قوم عبدالناصر کی حکومت کے خلاف سازش میں ملوث ہے۔ بس اس الزام کا ثبوت فراہم کرنے کی کسر ہے تاکہ شہریوں کو عدالت میں پیش کیا جا سکے۔ حکومت کو اس طرح کا تاثر دینا ان اداروں کے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ جن مناصب پر براجمان ہیں وہ ان کے انتہائی اہل ہیں۔ اگر ملکی حالات پر سکون اور مستحکم ہوتے اور عوام اپنی دھن میں مگن تہذیب و تمدن کے فروغ میں مصروف ہوتے تو جیسا کہ بعض مؤرخین کا خیال ہے، ایسے اداروں کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے جن کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ ارکانِ سلطنت کی حفاظت کے لیے یہ بھاری بھرکم تنخواہیں کہاں سے دی جاتی ہیں؟ سول انٹیلی جنس، ملٹری انٹیلی جنس، ادارہ تفتیش عامہ، ادارہ تفتیش عسکری، خفیہ پولیس برائے صدر جمہوریہ انفرمیشن بیورو زیر نگرانی سامی شرف پرسنل سکرٹری عبدالناصر —— ان میں سے ہر ادارے کے ایک ایک دو دو مخبر ہر کوچے، ہر بستی، ہر شہر اور ہر سرکاری اور غیر سرکاری دفتر میں پائے جاتے تھے۔ الغرض تحفظ امن عامہ کے ان اداروں کے تحت جو مخبر کام کر رہے تھے ان کی تعداد شاید عام شہریوں سے بھی زیادہ ہو۔ یہ اس سیاہ دور کی بات ہے جو گزر گیا اور ان شاء اللہ اب وہ دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

ابوزعبل کی جیل میں مَیں سترہ دن رہا۔ ۲۸۔ اگست ۱۹۶۵ء کو میں اُس میں داخل ہوا تھا اور تیرہ ستمبر ۱۹۶۵ء کو میں وہاں سے نکلا۔ ان تمام ایام میں لحظہ بھر بھی مجھے آرام نصیب نہیں ہوا۔ "اوکسلی" میں رہنے کی وجہ سے مجھے وہاں عجیب و غریب چیزیں دیکھنے کا موقع ملا۔ مثلاً:

ایک شخص گرفتار کر لیا گیا۔ تفتیش کے دوران اس کی جیب میں سے گیارہ ناموں کی ایک فہرست برآمد ہوئی۔ چنانچہ قدرتی طور پر وہ گیارہ افراد بھی گرفتار کر لیے گئے۔ یہ گرفتار شدہ شخص ان کی گرفتاری سے بے خبر تھا —— اور یہ بھی میرے قریب ہی لوہے کی سلاخوں سے لٹکا ہوا تھا۔ انٹیلی جنس والوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ گیارہ افراد طلبہ میں سے ہیں اور ان میں سے سب سے بڑے طالب علم کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ نہیں ہے تو اُن کے شکوک و شبہات کو مزید تقویت پہنچی کہ ہو نہ ہو حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے یہ "خام مواد" ضرور استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان تین طالب علموں کو تین روز تک بے تحاشہ مارا گیا۔ اور ان سے یہ منوایا جاتا رہا کہ وہ فی الواقع حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اس قدر

زد و کوب کیا گیا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئے اور آخر کار پولیس افسران مجبور ہوئے کہ اُن کے بارے میں اُس آدمی سے دریافت کیا جائے جس کی جیب سے ان کے ناموں کی فہرست برآمد ہوئی - مگر یہ کس قدر مضحکہ خیز بات تھی کہ بالآخر یہ تحقیق ہوا کہ اس شخص نے چند طلبہ کے نام اپنے طور پر منتخب کر کے اُن کی ایک فہرست تیار کر رکھی تھی کیونکہ وہ اپنی بستی کے کلب میں اُن کی ایک فٹ بال ٹیم تشکیل دینا چاہتا تھا -

ایسے لطائف بھی پیش آئے کہ خفیہ پولیس کے لوگ یہ انکشاف کرتے ہیں کہ ایک روز، ایک قہوہ خانے میں زید اور عمرو کے درمیان ایک مخصوص گفتگو ہوئی ہے - لہذا وہ اس "مخصوص بات" کی تحقیق کرنے کے لیے اُن تمام افراد کو گرفتار کر لیتے ہیں جو اس قہوہ خانے میں بالعموم آتے رہتے ہیں - اور تحقیق کا طریقہ وہی اختیار کیا جاتا ہے جس کا میں بار بار اوپر ذکر کر چکا ہوں -

ایک اور انتہائی درد انگیز اور حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا - یعنی ابوزعبل کی جیل میں میں نے دیکھا کہ بیٹا باپ کو تازیانوں سے مار رہا ہے - باپ بھی چیخ رہا ہے اور بیٹا بھی چیخ رہا ہے - اس منظر کو دیکھنے والے جتنے لوگ تھے اُن سب پر مراق سے ملتی جلتی اُسی طرح کی کیفیت طاری ہو گئی تھی جس کا ذکر دستوئیفسکی نے اپنے لٹریچر میں کیا ہے -

ابوزعبل کی ایک رات مجھے ہرگز فراموش نہ ہوگی - اس رات پوری جیل نظربندوں سے بھر چکی تھی - پولیس والوں کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ ہر شخص اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لے - تھوڑے عرصہ کے بعد دوبارہ یہی حکم جاری ہوا اور پھر اُسے ڈنڈوں کی ضرب سے نافذ کیا جانے لگا - (آپ کو تو یہ یاد ہو گا کہ جیل کی عمارت تین منزلہ تھی) - اور تمام بیرکوں کو حکم تھا کہ سب لوگ "اوکھلی" میں جمع ہو جائیں - اور مزید یہ کہ سب لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں اور ٹانگوں کے بل (جانوروں کی طرح) صحن میں آ جائیں - اور منہ سے بکریوں کی آواز نکالیں - اُوپر سے نیچے اُترنے میں کوئی نظم تو تھا نہیں - چنانچہ سب لوگ اسی انداز میں اُترے - ہر آدمی مادر زاد برہنہ تھا - اور اُس کی آنکھوں پر پٹی تھی ڈنڈوں کی ضربوں اور توہین و تذلیل کی فضا میں ننگے انسانوں کی رَو جیل کی سیڑھیوں پر مظلومی اور بے بسی کے ساتھ نیچے کی جانب بہہ رہی تھی -

"اوکھلی" کا پورا رقبہ نظربندوں سے اس قدر بھر گیا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی - ان سب افراد کو الگ الگ تازیانے مارنے کا حکم صادر ہوا - مگر اس کٹھن مہم کو سر کرنے کے لیے پولیس کے افراد ناکافی تھے

چنانچہ اس روز جیل کے پورے سٹاف سے مدد لی گئی جن میں سول ملازمین کے علاوہ اسپتال کا سٹاف بھی شامل تھا اور وہ لوگ بھی شریک تھے جو ابوزعبل جیل کے تنور میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ لوگوں کو نہایت وحشیانہ طور پر تازیانے لگائے گئے اور کسی بوڑھے، مریض، زخمی اور بچے کو اس عذاب سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ ہم نے سنا کہ "قائد عوام" کی طرف سے یہ احکام صادر ہوئے ہیں کہ عوام کو تازیانے لگائے جائیں۔

اس روز دو ہزار سے زیادہ اشخاص کی پیٹھوں پر تازیانے برسے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی زبانوں پر ہر وقت اللہ کی تسبیح اور حمد جاری رہتی تھی۔ وما نقموا منھم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید۔ سب لوگوں کی آنکھیں بندھی ہوئی تھیں اور وہ تازیانوں کی ضربوں کی شدت سے وارفتگی کے عالم میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ جب رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا یا تو ہر شخص کی زبان پر آہ وزاری اور درد و کرب میں ڈوبی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر کوئی مدد کو لپکنے والا نہ تھا۔ اس انسانیت سوز حادثہ کا عینی گواہ ہر وہ شخص ہے جو ستمبر ۱۹۶۵ء کے نصف اول میں ابوزعبل کی جیل میں رہا ہے اور ان میں سے اکثر لوگ ابھی بقید حیات ہیں۔ میں اس پولیس افسر کو بھی فراموش نہیں کر سکتا جو نیا نیا بھرتی ہوا تھا اور تعذیب کے دل ہلا دینے والے مناظر دیکھ دیکھ کر جیل کے ایک کونے میں بیٹھا رو رہا تھا۔

ابوزعبل میں چند میٹر کے فاصلے پر میرے قریب ایک مظلوم نظر بند رات بھر پینے کے لیے پانی مانگتا رہا مگر کسی نگران نے اسے ایک قطرۂ آب لا کر نہ دیا۔ جب صبح کی پہلی کرن پھوٹی تو اس شخص کی روح پرواز کر گئی اور وہ ابدی نیند سو گیا۔

انٹیلی جنس نے ابوزعبل کی جیل میں جن شہریوں کو اپنا "مہمان" ٹھہرا رکھا تھا۔ ان میں سے کوئی شخص ۳۱ اگست ۱۹۶۵ء کی بھیانک رات کو کبھی فراموش نہ کرے گا۔ یہ وہ تاریخ تھی جب عبدالناصر نے ماسکو میں سوویت نوجوانوں کے کلب میں اخوان المسلمون کی سازش کا انکشاف کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ ۱۹۵۴ء میں تو اس نے اخوان کو معاف کر دیا تھا لیکن اس مرتبہ ان کے ساتھ قطعاً رحمدلانہ برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ اس کی یہ دھمکی درست ثابت ہوئی۔ اس بیان کے بعد ابوزعبل کی جیل انسانیت کے ذبح خانہ میں تبدیل ہو گئی۔

ابو زعبل کی جیل میں مَیں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی تازیانوں کی بوچھاڑ کا نشانہ بنتے دیکھا۔ وہ اور کچھ اور میرے دوست مادرزاد برہنہ تھے اور ان کی پیٹھیں تازیانوں کی زد میں تھیں۔

ابو زعبل میں اُس وقت میں مستقبل کے بارے میں ہر اُمید سے ہاتھ دھو بیٹھا جب ہمیں چالان بھیجنے والے افسر کے سپرد کیا گیا۔ جو پولیس افسر ہمیں وصول کر رہا تھا اُس نے وصول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا اور تمام نظربندوں کو بڑی توجہ سے گننے لگا۔ مگر چالان افسر نے کہا: "فکر نہ کرو، تعداد کی جو کمی واقع ہوگی میں اُسے پورا کر دوں گا۔" گویا وہ انسانوں کو نہیں بلکہ بکریوں کے ایک ریوڑ کو دوسرے کے حوالے کر رہا تھا۔

ابو زعبل میں مجھے ڈاکٹر احمد الملط جو دل کے اپریشن کے ماہر استاذ ہیں نظر آئے۔ انہیں پاؤں سے ٹھوکریں ماری گئیں، اور پھر اُن پہ ہر نوعیت کا آلۂ ضرب آزمایا گیا یہاں تک کہ وہ بیچارے گویائی سے محروم ہو گئے۔

میں نے سینکڑوں بے گناہ انسان ابو زعبل میں دیکھے جنہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ کس پاداش میں انہیں گرفتار کیا گیا ہے؟ بلکہ خود گرفتار کرنے والے بھی نہ جانتے تھے کہ وہ انہیں کیوں گرفتار کر لائے ہیں؟

(باقی)

رسائل و مسائل

جن تک اسلام نہیں پہنچا

سوال: جب میں اس سیدھی سادی سی بات پر غور کرتا ہوں کہ اسلام کو قبول کرنے والے جنت میں جائیں گے اور قبول نہ کرنے والے جہنم میں جائیں گے، تو معاً میرے ذہن میں ان بے شمار افراد اور قوموں کی تصویر آجاتی ہے جن تک اسلام کا پیغام نہ پہنچا ہے، نہ پہنچنا ممکن ہے۔ مثلاً آج کل کے افریقہ کے دُور دراز جنگلوں میں رہنے والے حبشی، لاطینی امریکہ کے وہ عوام جنھوں نے اسلام کا نام کبھی کسی زبان سے سُنا تک نہیں ہے، برما، ملایا اور تھائی لینڈ کے جنگلات میں رہنے والے لوگ، تبت کے پہاڑوں اور سائبیریا کے انتہائی شمالی علاقوں میں رہنے والے اسکیمو۔ میں حیران ہوں کہ ان لوگوں سے قیامت کے دن کس قسم کا حساب لیا جائے گا؟

بات صرف یہیں تک نہیں ٹھہرتی بلکہ دُنیا میں کروڑوں اور اربوں کی تعداد میں وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جنھوں نے بطور مذہب اسلام کا محض نام ہی سُنا ہے۔ مگر کیا اسلام کا محض نام ہی سُن لینا اس مقصد کے لیے کافی ہے کہ اُسے جہنم کی ہولناک سزا دی جائے؟ میں کہوں گا نہیں، اس لیے کہ ان میں سے ۹۵ فیصد انسانوں کو کبھی اسلام کا صحیح پیغام سننے یا سمجھنے کا موقع نہیں ملتا۔ آپ کہیں گے کہ پھر خود کیوں اسلام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے؟ لیکن یہ دلیل میری نظر میں اہمیت نہیں رکھتی۔ اپنے کافرانہ ماحول کے اندر اسلام کی بات کو اُس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے اور ایک ایک اعتراض کو رفع کرنے کے لیے (وہ تمام اعتراضات جو مختلف لوگوں مثلاً عیسائیوں،

یہودیوں، کمیونسٹوں کی طرف سے کیے جاتے ہیں) ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اتنا لمبا عرصہ جو نفسیاتی لحاظ سے کسی عام انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے ـــــ مثلاً آپ اس فرد کا تصور کیجیے جو امریکہ کے کسی عام شہر میں پیدا ہوا ہے۔ مذہب اس کی خاندانی زندگی سے تقریباً خارج ہو چکا ہے اور اگر ہے تو وہ صرف اتوار کے دن کلیسا میں حاضری لگوانے تک۔ اسے عیسائیوں کے عقاید کا بھی کوئی خاص علم نہیں ہے۔ وہ اپنی سوسائٹی کے اندر مکمل طور پہ گھرا ہوا ہے۔ وہ سیکولر تعلیم حاصل کرتا ہے۔ معاش کے لیے اُسے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بالآخر وہ مر جاتا ہے۔ کیا واقعی اسلام قبول نہ کرنے میں اس کا کوئی قصور ہے؟ ـــــ ممکن ہے زندگی کے کسی لمحے میں اس نے اسلام کا نام سن لیا ہو، شاید اس نے کسی مسلمان فرد کو دیکھ لیا ہو۔ جس کے کرتوت دیکھ کر اسے اسلام سے نفرت ہو گئی ہو۔ کبھی اس نے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہو تو اسے معلوم ہو گیا ہو کہ رسول اللہؐ نے تو چار شادیوں کی اجازت دی ہے (جن کا تصور وہ اپنے معاشرے میں ناممکن خیال کرتا ہوگا) یا اُسے قرآن مجید کی چند آیات پڑھوا کر بتا دیا گیا ہوگا کہ یہ معاذ اللہ ایک بے ربط کتاب ہے اور رد میں اس نے اسلام کے متعلق مزید سوچنا بند کر دیا ہوگا۔

اس لمبی مثال سے میرا مقصود یہ ہے کہ انسان کی نفسیات ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ کسی معاملے میں اتنا طویل غور و فکر نہیں کر سکتا کہ وہ دنیا بھر کے نظریات کھنگال کر حق تک پہنچ جائے۔ اس لیے جب یہ اُس کی مجبوری ہے تو پھر جزا اور سزا کا کیا سوال؟ میں ایک منطقی مثال بھی دینا چاہتا ہوں۔ تحریک اسلامی کے کارکنوں میں سے کتنوں نے حق کی جستجو میں اپنی عمریں کھپائی ہیں؟ کیا ہم میں سے ایک فیصد نے بھی اشتراکیت کا خود اشتراکیت کی کتابوں سے مطالعہ کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو کیا اس سے صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ حق کی جستجو ہم میں بھی اتنے اعلیٰ پیمانے پہ نہیں ہے؟

میرے نزدیک یہ بھی عین ممکن ہے کہ کوئی شخص مکمل خلوص کے ساتھ مختلف نظریات کا مطالعہ کرے (ایسا خلوص جس میں شک کی گنجائش نہ ہو)۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسلام کے راستے تک نہ پہنچے۔ کیا ایسے لوگ ہم نے نہیں دیکھے جو "صُمٌّ بُکْمٌ" کی تعریف میں نہیں آتے؟ جنھوں نے تحریک اسلامی کا لٹریچر پڑھا تھا، اس کے باوجود کمیونسٹ بن گئے؟ یا کوئی شخص جو ارتقا کے نظریے کو مانتا ہو (جس کے خلاف ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے) یا جو نفسیات، فلسفہ، معاشیات، عمرانیات

وغیرہ میں کسی بھی دوسرے گمراہ کن فلسفے سے نہایت ہی پُرخلوص طریقہ سے متاثر ہوا ہے آخر کس وجہ سے جہنم میں بھیجا جائے ؟

پھر جب میں تاریخ کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالتا ہوں تب بھی انسان مجھے بے قصور نظر آتے ہیں ۔ مثلاً جب رسول اللہؐ مبعوث ہوئے اس وقت ساری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اتمام حجت زیادہ سے زیادہ سرزمینِ عرب تک ہو چکا تھا ۔ آخر عرب کے باہر کے اس زمانے کے لوگوں نے کیا قصور کیا تھا کہ اسلام قبول نہ کرنے کی پاداش میں انہیں آگ کے شعلوں میں جھونکا جائے ؟

پس اگر آپ اس صورتِ حال پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اصطلاحی کفار میں سے بمشکل پانچ فیصد جہنم میں بھیجے جانے کے لائق ہیں۔

اب آیئے چند باتیں اصطلاحی مسلمانوں کے متعلق بھی کر لیں:-

یہ ستّر کروڑ مسلمان ، جو محض مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان ہیں۔ کیا محض یہ اتفاق ان کے لیے جنت واجب کر دیتا ہے ؟ یقیناً ہرگز نہیں۔ میرے نزدیک ان میں سے صرف وہ لوگ مسلمان ہیں جو اسلامی نظام کے لیے کسی نہ کسی انداز میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ کسی خاندانی مسلمان اور کسی خاندانی عیسائی میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا ۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان تمام لوگوں کو جہنم میں بھیج دیا جائے ۔ مگر یہ لوگ کم از کم جنت کے حقدار بھی دکھائی نہیں دیتے ۔ ان میں سے پانچ فیصد بھی ایسے لوگ نہیں جنہوں نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا ہو ۔

لیکن اسلامی تحریک کے ساتھ منسلک نہ ہونے کی بھی بے شمار معقول وجوہات ممکن ہیں ۔ مثلاً اکثریت کو ابھی تک ہمارا پیغام پہنچا ہی نہیں ۔ ان کو بھلا کیوں کر قصوروار قرار دیا جا سکتا ہے ؟

پس میرے خیال میں بمشکل دس فیصد انسان ایسے ہوں گے جو جزا و سزا کے قابل ہوں گے باقی نوے فیصد نہ جزا کے قابل ہیں نہ سزا کے ۔

اپنی ذات کے متعلق بھی آپ کو یہ بتا دوں کہ میں ایک ذمہ دار کارکن ہوں۔ تفہیم القرآن کا مکمل مطالعہ کیا ہے ۔ مولانا کی تقریباً ساری کتب پڑھی ہیں اور اسلامی تحریک کے باقی ذمہ دار حضرات کی کتابیں بھی مطالعہ کر چکا ہوں ۔ یہ وضاحت اس لیے کر رہا ہوں کہ جواب دیتے وقت آپ اس کو مد نظر رکھیں۔

اپنے اس شک کو میں نے سادہ ترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ جب میں اس معاملہ پر مزید غور کرتا ہوں تو ایک ایسی عجیب و غریب صورت سامنے آتی ہے جس سے میرا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ اس سے میرے کام پر بھی خراب اثر پڑتا ہے۔

جواب:- (از عبدالحمید صدیقی) آپ کے ذہنی شکوک پڑھ کر میرا تاثر یہ ہے کہ آپ نے خواہ مخواہ ایک ایسے مسئلے پر غور و فکر شروع کر دیا ہے جس کا فیصلہ کرنے کی کوئی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے، اور نہ آپ کے پاس علم کے وہ ذرائع ہیں جن سے آپ اس کا صحیح فیصلہ کر سکتے ہوں۔ یہ فیصلہ تو اللہ کو کرنا ہے کہ وہ کسے جزا دے اور کسے سزا۔ وہی علیم و خبیر یہ جانتا ہے کہ کون سزا کا مستحق ہے اور کیوں! اور کون جزا کا مستحق ہے اور کیوں؟ آپ کے پاس آخر وہ کون سا پیمانہ ہے جس کے ذریعہ آپ اس امر کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بمشکل دس فیصد انسان ایسے ہوں گے جو جزا اور سزا کے قابل ہوں گے؟

قرآن مجید میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ حق معلوم کرنے کا ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیمات ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد نجات کا واحد راستہ یہی ہے کہ اسلام کو بطور دین قبول کیا جائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کے آخری پیغمبر کی حیثیت سے ایمان لا کر اُن کی ہدایات کی بلاچون و چرا اطاعت کی جائے۔ ہمیں جزا و سزا کے بارے میں اصولی تعلیم یہی دی گئی ہے۔ باقی رہا ان لوگوں کا معاملہ جن تک آپ کے بقول اسلام کا نام تک نہیں پہنچا تو اُسے علیم و خبیر اور عادل و رحیم خدا پر چھوڑ دینا چاہیے جو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے، جو ہر شخص کے حالات اور ظاہر و باطن کو پوری طرح جانتا ہے اور آخرت میں ہر شخص کے مقدمے کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ کرے گا۔ البتہ اُمتِ مسلمہ سے خدا کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے میں جو کوتاہی سرزد ہوتی ہے اس کے ازالہ کی اُسے جلد از جلد فکر کرنی چاہیے، اور باری تعالیٰ کے حضور میں اپنی غفلتوں کے لیے صدقِ دل کے ساتھ معافی مانگنی چاہیے۔

وہ لوگ جن تک اللہ کا پیغام پہنچا ہے اور وہ اپنے تعصبات کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں لاتے تو وہ کافر ہیں اور وہ اسی سزا کے مستوجب ہیں جو حق کو جھٹلانے والوں کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ آپ نے اپنے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ محض اس بنیاد پر پیدا کیا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص تک اسلامی تعلیمات پہنچانا اور ان کی ہر رُلم انہیں سمجھانا اور اس کے ہر جز کا انہیں قائل کرنا،

مسلمانوں کا ہی فریضہ ہے ۔ اور اس معاملے میں خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ۔ درآنحالیکہ آپ کی یہ بنیاد ہی کمزور ہے ۔ ایک نبی اور اس کے متبعین کا کام صرف اس قدر ہوتا ہے کہ عامۃ الناس کو احکامِ الٰہی سے روشناس کرا دیں ۔ ایک ایک فرد تک پہنچ کر اسے ان احکام کی حکمتیں سمجھانا اُن کے فرائض میں داخل نہیں ۔ آج دنیا کا کون سا ایسا معاشرہ ہے جو اسلام کے نام سے ناواقف ہے اور اسے یہ حقیقت معلوم نہیں ہے کہ دنیا کے تین چار مذاہب میں اسلام ایک اہم مرتبہ اور مقام کا حامل ہے ؟ اگر آج کا انسان ہر نئی ایجاد کو جاننے کے بارے میں بے تاب ہوتا ہے ۔ اور دنیا کی معمولی ضروریات فراہم کرنے کے لیے بیدار مغزی کا ثبوت دیتا ہے تو آخر روح کے تقاضوں کے متعلق وہ کیوں اتنا بے حس اور بے پروا ہے کہ ان کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچنا گوارا نہیں کرتا ؟

دینِ حق سے مجرمانہ تغافل برتنے والے لوگوں کا دفاع کرتے کرتے آپ غالباً اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ انسان کے اندر دیگر حواس کے ساتھ ایک حاسۂ مذہبی بھی پایا جاتا ہے جو ہر انسان سے، بشرطیکہ وہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل مُردہ نہ ہو گیا ہو، اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ کوئی ایسا نظامِ فکر و عمل اپنائے جو اس کی دنیا سنوارنے کے ساتھ اُس کی روح کو سکون بخشے اُس کے اندر ایک ایسا اخلاقی احساس پیدا کرے جس سے اس کی زندگی کے مختلف گوشوں میں نظم و ضبط پیدا ہو اور ذہنی اضطراب خلفشار کی صورت اختیار نہ کرنے پائے۔ یہ انسانی فطرت کا بنیادی مطالبہ ہے ۔ کیا اس مطالبہ کو نظرانداز کر کے سچے دین کی تلاش نہ کرنا، فطرت سے بغاوت نہیں اور جو شخص اپنی فطرت کے خلاف آمادۂ بغاوت ہو گیا وہ راہ یاب ہو سکتا ہے ؟ ایسے باغیوں کی عقل کا آپ ماتم تو کر سکتے ہیں لیکن ان کے باغیانہ طرزِ عمل کو آخر آپ کس منطق کی رُو سے جائز قرار دیتے ہیں ؟

آخر میں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ نے اسلام اور اسلامی تحریک میں خلطِ مبحث کر دیا ہے ۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا ہے ۔ کیا آپ کی نظر سے جماعتِ اسلامی کے محترم بانی اور اس کے دیگر قائدین کی یہ صراحت نہیں گزری کہ جماعتِ اسلامی کو اسلام کی اجارہ دار نہ سمجھا جائے اور اس بنا پر اس سے وابستگی اور علیحدگی کو اسلام اور کفر کا مسئلہ نہ بنایا جائے ۔ جو لوگ اسلام کے دامن سے وابستہ ہیں خواہ ان کا جماعت سے کوئی معمولی سا تعلق بھی نہیں وہ ان سارے انعامات کے مستحق ہو سکتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے مومنین سے وعدہ کیا ہے اور ابدی جہنم اُن لوگوں کا مقدر ہے جن لوگوں نے اللہ اور رسولؐ سے بغاوت کی راہ اختیار کی ہے، نہ کہ "تحریکِ اسلامی" سے ۔

مطبوعات

الدعوات الماثورات مرتبہ: جناب عبید الحق صاحب ندوی۔
صفحات: ۱۸۰ - کتابت وطباعت عمدہ
کاغذ سفید - قیمت: ندارد
ناشر: المکتبۃ العلمیہ - لاہور۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی غرض تخلیق اپنی عبادت قرار دیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کو عبادت کی اصل روح قرار دیا ہے۔ فی الواقع انسان جب مصائب میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو بے یار و مددگار تصور کر کے بارگاہِ ایزدی میں عجز و انکسار سے اپنی حاجت برآری کے لیے ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اُس کے اندر اپنے بندہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کے مالک و آقا ہونے کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ یہی احساس بندگی اور اظہار بے چارگی عبادت کی اصل روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو انسانی زندگی کے ایک ایک لمحہ کے لیے بڑی جامع اور پُرتاثیر دُعاؤں کی تعلیم دی ہے۔

جناب عبید الحق صاحب ندوی نے بڑی کاوش اور حسنِ انتخاب کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعاؤں کا ایک حسین مرقع الدعوات الماثورات کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یوں تو بازار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے مجموعے عام دستیاب ہیں لیکن الدعوات الماثورات کے نام سے ندوی صاحب نے جو مجموعہ تیار کیا ہے اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر دُعا کا اُردو ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ پہلی سطر میں تحت اللفظ ترجمہ ہے اور دوسری سطر میں رواں ترجمہ ہے اس طرح عربی زبان سے مناسبت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کے آغاز میں دُعا کی فضیلت اور اُس کی حقیقت، قبولیتِ دُعا کے اوقات اور دُعا کے آداب کے بارے میں

مستند احادیث بھی درج کر دی گئی ہیں۔

طباعت بڑی جلی اور روشن ہے۔ سرورق سادہ لیکن جاذبِ نظر ہے۔ قیمت اورسنِ طباعت درج نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دعاؤں کا یہ مرقع محض حصولِ ثواب کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

کتاب الحج و کتاب اللقیط (اُردو)

ترجمہ: پروفیسر غازی احمد صاحب

صفحات: کتاب الحج ۳۱۱ قیمت: -/۱۲ روپے

صفحات: کتاب اللقیط ۱۱۶ قیمت: ۵/۵۰ روپے

ناشر: المکتبۃ العلمیہ۔ لاہور۔

ہدایہ فقہ حنفی کی ایک مشہور و معروف اور بنیادی کتاب ہے۔ عربی مدارس میں اسے اہتمام کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے اور علم فقہ کا کوئی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اصل کتاب عربی میں ہونے کی وجہ سے اس سے صرف اہل علم اور عربی جاننے والے اصحاب ہی استفادہ کر سکتے تھے۔ یہ فقہی خزینہ اُردو جاننے والے تشنگانِ علم کی دسترس سے باہر تھا۔ کچھ عرصہ سے جناب عبید الحق صاحب ندوی نے جو مکتبۂ علمیہ کے مالک ہیں اور خود بہت بڑی علمی شخصیت بھی ہیں، ہدایہ کا اُردو ترجمہ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس سے قبل کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الزکوٰۃ، کتاب النکاح، کتاب الطلاق کا ترجمہ چھپ چکا ہے اور اہلِ علم سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب کتاب الحج اور کتاب اللقیط کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس اور رواں ہے۔ عمدہ سفید کاغذ پر عربی ٹائپ میں چھپا ہے۔ اُمید ہے کہ اصحابِ ذوق اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں گے۔ اسلامیات کے طلبہ کے لیے خاص طور پر نہایت ہی کار آمد کتابیں ہیں۔ عام سکولوں کالجوں اور دفتروں کی لائبریریوں میں ان کا ایک ایک نسخہ ضرور ہونا چاہیے۔

(بقیہ اشارات) کی وجہ سے کسی خاموش تعمیری کام کے متقاضی ہوں تو جوشیلے کارکن ہمت ہار بیٹھتے ہیں کیونکہ اُن کے ذہن غیر ہنگامی کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے درآنحالیکہ قوموں کی ترقی میں ہنگامی مہمات سے بڑھ کر غیر ہنگامی کاموں کی اہمیت ہوتی ہے، تعمیر کا بیشتر حصہ ان خاموش کاموں ہی کا رہین منّت ہوتا ہے۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہی بلاشبہ تنور کو گرم کرتے ہیں لیکن یہ روٹیاں پکانے کے لیے کسی اعتبار سے موزوں نہیں ہوتے۔ روٹیاں تو ہلکی آنچ ہی میں صحیح طور پر پکتی اور تیار ہوتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ کارکنوں کی تربیت کا کام افراتفری کے عالم میں تو نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے پُرسکون ماحول ہی میں کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا جا سکتا ہے اور اُسے انجام دینے کے لیے ایسے مربی رہنماؤں کی ضرورت ہے جن کے ساتھ کارکنوں کو گہری محبت اور عقیدت ہو اور وہ دلسوزی بے لوثی، حکمت اور دانائی کے ساتھ اس مقدس فرض کو ادا کریں۔ جب رہنما ہنگامی ضروریات کے تحت کارکنوں کے جذبات مشتعل کر کے اُن سے کام لے لیتے ہیں اور بعد میں نہ تو اُن سے ربط و ضبط رکھتے ہیں اور نہ اُن کی تربیت کی فکر کرتے ہیں تو کارکنوں کے ذہنوں میں قدرتی طور پر یہ احساس اُبھرتا ہے کہ انہیں اُن کے "آقا" جب چاہتے ہیں حسبِ ضرورت استعمال کرتے ہیں اور بعد میں اُن سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ رہنماؤں کے بارے میں کسی ملک کے عوام کی یہ بدگمانی اُس کے لیے خطرے کا الارم ہے۔

کیا

- آپ نے اِس کتاب کا مُطالعہ کیا ہے جس کی بدولت بہت سے مُشرکین مشرّف باسلام ہو چکے ہیں ؟
- جو دُنیا کی ۲۲ زبانوں میں چھپ رہی ہے ۔
- جس کی کروڑوں جلدیں دُنیا کے گوشے گوشے میں زیرِ مطالعہ ہیں ۔

؟

آپ بھی اپنے دینِ اسلام کی حقیقت کو جاننے کے لیے آج ہی

سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی کی تصنیف

دینیات (نیا ایڈیشن)

کا مُطالعہ کیجیے

جامع مگر مختصر اور عام فہم تشریحات سے آراستہ ایک ایمان افروز کتاب جسے عام اُردو دان احباب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی شوق و ذوق سے پڑھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہیں ۔ سکولوں اور کالجوں میں منظور شدہ ۔ ہر بُک اسٹال سے دستیاب ۔ قیمت: ۷/- روپے ۔

اِدارۂ ترجمان القرآن، اِچھرہ ۔ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۴